پتّوں پر لکھی تحریریں

(افسانے و انشائیے)

دیپک بُدکی
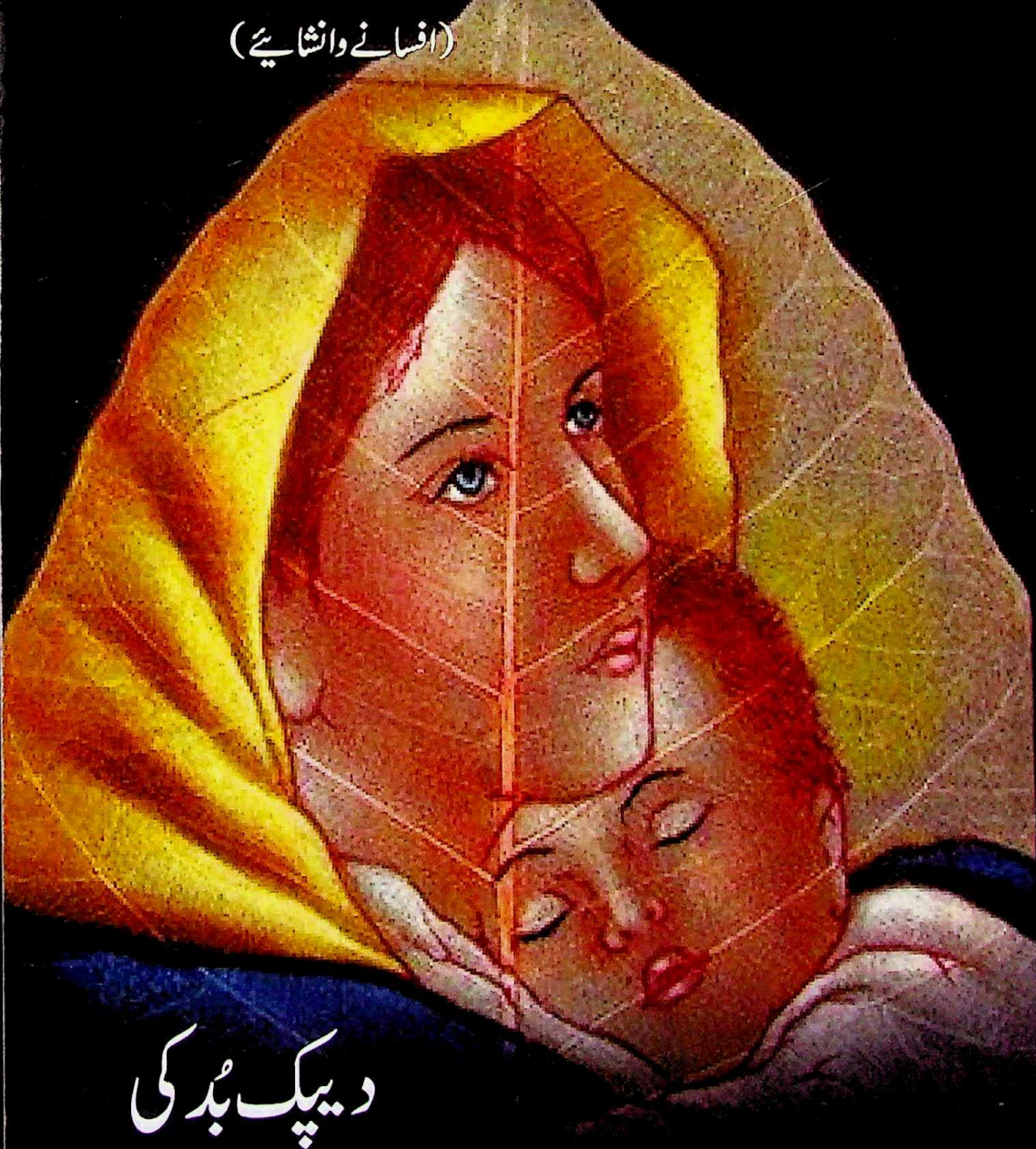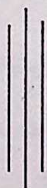
دیپک بُدکی

پتّوں پر لکھی تحریریں

(افسانے)

مصنف کی تصانیف

☆ افسانوں/افسانچوں کے مجموعے:

۱)ادھورے چہرے(ایڈیشن سوم۲۰۱۴، ہندی ۲۰۰۵ء) ۲)چنار کے پنجے(ایڈیشن دوم ۲۰۱۴ء، ہندی ۲۰۱۱ء)

۳)زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی(ایڈیشن دوم ۲۰۱۸ء) ۴)ریزہ ریزہ حیات (۲۰۱۱ء)

۵)روح کا کرب (۲۰۱۵ء) ۶)مٹھی بھر ریت[افسانچے](۲۰۱۵ء)

۷)اب میں وہاں نہیں رہتا(۲۰۱۷ء) ۸)جڑوں کی تلاش (۲۰۱۹ء)

۹)یہ کیسا رشتہ![افسانچے] (۲۰۲۱ء) ۱۰)پتّوں پر لکھی تحریریں (۲۰۲۲ء)

☆ ناول:

۱۱) اپنا اپنا سچ (۲۰۲۲ء)

☆ خود نوشت سوانح عمری:

۱۲) لوحِ حیات (۲۰۱۸ء)

☆ تنقید و تبصرے:

۱۳) عصری تحریریں (۲۰۰۶ء) (۱۴) عصری شعور (۲۰۰۸ء)

۱۵) عصری تقاضے (۲۰۱۳ء) (۱۶) عصری تناظر (۲۰۱۸ء)

۱۷) عصری نقوش (۲۰۱۹ء) (۱۸) جموں و کشمیر کا عصری ادب(۲۰۱۹ء)

۱۹) ادبی مباحثے (۲۰۱۹ء) (۲۰) عصری زاویئے (۲۰۲۰ء)

۲۱) کرشن چندر- میری نظر میں(۲۰۲۱ء) ۲۲)عصری رجحانات (۲۰۲۲ء)

۲۳) عصری تخلیقات (زیرِ طبع)

☆ تحقیق

۲۴)اردو کے غیر مسلم افسانہ نگار(ایڈیشن اول ۲۰۱۷ء، ایڈیشن دوم ۲۰۲۰ء)

÷ملنے کا پتہ÷

(۱) میزان پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرس، بٹہ مالو، سرینگر، کشمیر-۱۹۰۰۰۹

(۲) ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۳۱۹۱، وکیل اسٹریٹ، کوچہ پنڈت، لال کنواں دہلی-۱۱۰۰۰۶

(۳) جی این کے پبلی کیشنز، کمار محلہ، چرار شریف، بڈگام، کشمیر-۱۹۱۱۱۲

پتّوں پر لکھی تحریریں

(افسانے)

دیپک بُدکی

میزان پبلشرز اینڈ ڈسٹربیوٹرس

بالمقابل فائر اینڈ ایمرجنسی سروسز ہیڈکوارٹرس

بٹہ مالو، سرینگر، کشمیر-۱۹۰۰۰۹

نام کتاب : پتوں پر لکھی تحریریں (افسانے)

مصنف : دیپک بُدکی

پتا : ۱۰۲-اے، ایس جی امپریشن، سیکٹر۴-بی، وسُندھرا، غازی آباد-۲۰۱۰۱۲

ای میل : deepak.budki@gmail.com موبائل:9868271199

قیمت : درون ملک:-/۳۹۹روپے (تین سوننانوے روپے)؛ بیرون ممالک: ۷ڈالر

اشاعت : پہلا ایڈیشن - ۲۰۲۳ء

ناشر : میزان پبلشرز اینڈ ڈسٹر بیوٹرس، بالمقابل فائر سروسز ہیڈ کوارٹرس،

بٹہ مالو، سرینگر کشمیر-۱۹۰۰۰۹

÷÷÷÷÷÷÷÷÷÷÷÷÷÷÷÷

PATTON PAR LIKHI TEHREEREIN

(Short Stories)

Author: Deepak Budki

Price: Inland:Rs399/-; Foreign: $7/-

Meezan Publishers & Distributors,

Opposite Fire Services Hqrs,

Batamaloo,Srinagar, Kashmir-190009

Tel: Off: 0194-2457215 Fax: 2457215

Mobile +91 9419002212; 7006773403

e mail : meezanbooks2020@gmail.com

انتساب

ان کورونا مجاہدوں کے نام
جنھوں نے اپنی زندگی داؤ پر لگا کر
انسان کے زندہ رہنے کی امید برقرار رکھی

تحریر ظھری

اس مجموعے کے سبھی کردار، مقامات اور
واقعات فرضی ھیں۔ کسی شخص، مقام یا واقعہ
سے کوئی مناسبت محض اتفاق ھوسکتا ھے
جس کے لیے مصنف یا ناشر پر کوئی ذمّے داری
عاید نہیں ھو گی۔

÷÷÷÷÷

سپاس نامہ

اس مجموعے میں سولہ افسانے اور دو انشائیے شامل ہیں جو مختلف رسائل میں وقتاً فوقتاً شائع ہو چکے ہیں۔ اشاعت کی تفصیل ذیل میں درج ہے۔

(۱) جرأت اظہار [ماہنامہ آج کل نئی دہلی، جلد ۷۹، شمارہ ۲، ستمبر ۲۰۲۰ء]؛ (۲) تیرا سچ میرا سچ [تخلیقات-۲، کتابی سلسلہ، الہ آباد، اکتوبر ۲۰۲۰ء؛ مکالمہ آن لائن پاکستان، ۱۵ مارچ ۲۰۲۱ء]؛ (۳) بے نام سورما [ماہنامہ شاعر ممبئی، افسانہ نمبر ۲۰۲۰ء، اکتوبر ۲۰۲۰ء؛ بے لاگ ڈاٹ کام، پاکستان؛ صبح بہاراں دولتانہ پاکستان، جلد ۸، شمارہ ۲، اگست ۲۰۲۱ء]؛ (۴) خود سر صحافی [روح ادب کولکتہ]؛ (۵) پتوں پر لکھی تحریریں [ایوان اردو دہلی، جلد ۳۴-۳۳، شمارہ ۲، ۱، ۱۲، اپریل - جون ۲۰۲۰ء]؛ (۶) سلگتے خواب [ایوان اردو دہلی، جلد ۳۴، شمارہ ۶، اکتوبر ۲۰۲۰ء]؛ (۷) شہادت کا صلہ [انتساب عالمی سرونج، جلد ۹، شمارہ ۳-۲، اپریل - ستمبر ۲۰۲۱ء]؛ (۸) خوابوں کا کہرا [ندائے گل، لاہور، سالنامہ ۲۰۲۰ء]، نگینہ سرینگر ۲۰۲۱ء؛ (۹) اجاڑ مکان کی آتم کتھا؛ (۱۰) وہ دکھ بھرا دن [عالمی زبان سرونج، جلد ۲، شمارہ ۸، جنوری ۲۰۲۰ء]؛ (۱۱) کالے حروف کا ساحر؛ (۱۲) اچھے دن [سہ ماہی کوہ ماراں سرینگر، جولائی - ستمبر ۲۰۲۱ء]؛ (۱۳) ماسٹر جی [ماہنامہ آج کل نئی دہلی، جلد ۸۰، شمارہ ۱۱، جون ۲۰۲۲ء؛ (۱۴) آج جانے دو [دربھنگہ ٹائمز، جلد ۱۶، شمارہ ۱، اپریل - جون ۲۰۲۱ء]؛ (۱۵) ایک یادگار یاترا [عالمی فلک دھنباد، شمارہ ۱، اکتوبر - دسمبر ۲۰۲۰ء]؛ (۱۶) فرد تعلیقہ؛ (۱۷) سونٹے؛ (۱۸) صوتی آلودگی [عالمی زبان سرونج ۲۰۱۷ء]۔

مذکورہ بالا رسائل و اخبارات کے مدیروں کا میں تہہ دل سے سپاس گزار ہوں کہ انھوں نے میرے افسانوں کو اپنے موقر رسالوں و اخباروں میں شائع کیا۔ اس کے علاوہ میں ان قارئین کا بھی شکر گزار ہوں جنھوں نے ان افسانوں کو پڑھا اور سراہا۔

مزید ان دوستوں اور ادیبوں کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے خاکسار کی ہمیشہ حوصلہ افزائی کی اور اپنی قیمتی آرا سے نوازا۔

اس مجموعے کی کمپوزنگ، ترتیب وتزئین میں نے خود ہی کی ہے تاہم پبلشر کی محبتوں کا اعتراف کرنا میرا فرض بنتا ہے کیونکہ اس کی کوششوں کی بدولت ہی یہ مجموعہ منظر عام پر آرہا ہے۔

دیپک بُدکی

فہرست

پیش لفظ

تین سال پہلے میرا ساتواں افسانوں کا مجموعہ 'جڑوں کی تلاش' منظر عام پر آیا تھا۔ اس کے علاوہ دو افسانچوں کا مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ حال ہی میں میرا پہلا ناول 'اپنا اپنا سچ' منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوا جس کی کافی پذیرائی ہوئی۔ اب 'پتّوں پر لکھی تحریریں' عنوان سے ایک اور افسانوں کا مجموعہ قارئین کی نذر کر رہا ہوں۔

اس مجموعے میں گذشتہ تین برسوں میں لکھے گئے افسانے شامل ہیں۔ اس دورانیے میں سارا عالم ایک بحرانی کیفیت سے گزر گیا۔ کورونا وائرس (Coronavirus) نے ساری دنیا کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وبا کی صورت میں قیامت آ گئی ہے اور شاید دنیا اس وبا سے نہیں بچ پائے گی۔ میری عمر بہتّر سال کی ہو چکی ہے۔ میں نے ان بہتر سالوں میں کئی مصیبتیں جھیلی ہیں، بچپن میں ماں کا سایہ سر سے اٹھ گیا، گریجویشن میں پھپیرا بھائی کھو دیا، پوسٹ گریجویشن کے دوران سوزشِ قولون نے عاجز کر دیا، ۱۹۹۰ء میں اپنی جڑوں سے اکھڑ کر ہجرت کے کرب سے دوچار ہوا لیکن ایسی وبائی صورت حال کے بارے میں کبھی گمان بھی نہ گزرا تھا۔ دمِ تحریر تک دنیا میں ۵۳ر کروڑ لوگ کووِڈ-۱۹ (Covid-19) کی چپیٹ میں آ چکے ہیں جن میں سے ۶۳ر لاکھ سے زیادہ لوگ فوت ہو چکے ہیں۔ ترقی یافتہ اور چند ترقی پذیر ممالک ہنگامی طور پر اس وبا سے چھٹکارا پانے کی سبیلیں کرتے رہے۔ سائنس دانوں اور دوا ساز کمپنیوں کے تحقیق نگاروں کی ایک فوج کورونا وائرس کے خلاف ٹیکہ (Vaccination) دریافت کرنے کے لیے دن رات جُٹ گئی اور

بہت حد تک کامیاب بھی ہوئی۔ خوش آئند بات یہ رہی کہ ہندوستان کی سودیشی دواساز کمپنیوں نے، جو ماضی میں مغربی ممالک پر انحصار کرتی تھیں، اب کی بار خود ہی ٹیکہ ایجاد کیا اور آج صورت حال یہ ہے کہ ملک کی ۱۳۰ رکروڑ آبادی میں تقریباً ساری بالغ آبادی دونوں ٹیکے لگوا چکی ہے اور اب ٹیکہ لگانے کی یہ مہم نابالغوں کے لیے بھی شروع ہو چکی ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ سرکار نے طبی سہولیات، اسپتالوں کی دستیابی، آکسیجن سپلائی، حفاظتی لباسوں (PPE) اور ماسکوں (Masks) کی فراہمی پر بھی فوری توجہ دی تا کہ ملک اس وبا کے قہر سے محفوظ ہو سکے۔ تاہم یہ وائرس اتنا ڈھیٹ ثابت ہو رہا ہے کہ ہر سال تقلیب ماہیت کرتا ہے اور اس کے نئے نئے اسٹرین پیدا ہوتے ہیں جن پر قابو پانا مشکل ہو رہا ہے۔

اس وبائی دور میں ڈاکٹروں، نرسوں اور پیرا میڈیکل ملازموں نے جس ہمت اور حوصلے سے اپنے فرائض انجام دیے، انسانی تاریخ میں اس کی نظیر ملنا بہت مشکل ہے۔ ان میں سے کئی افراد اپنا فرض نبھاتے ہوئے شہید بھی ہوئے۔ میں ان سبھی شہیدوں کو خراجِ عقیدت پیش کرتا ہوں۔ ان کی کوششوں کے بغیر بنی نوع انسان کو بچانے کی یہ جنگ ناکام رہتی۔ ان کے علاوہ دوسرے کئی شعبوں میں کام کرنے والوں کو بھی آٹھوں پہر مستعد رہنا پڑا تا کہ حواس باختہ لوگوں کو قابو میں رکھا جائے اور ان تک ضروریات زندگی پہنچائی جائیں۔

کورونا سے متعلق میں نے چند افسانے رقم کیے ہیں جو اس مجموعے میں شامل ہیں۔ یہ افسانے وبا کے خلاف میرے فوری ردِعمل کا نتیجہ ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی کئی افسانے مجموعے میں شامل ہیں جو انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی عکاسی کرتے ہیں۔ کچھ میرے تجربات سے متعلق ہیں اور کچھ ماضی کی المناک یادوں سے جو میرے وجود کا ناسور بن کر رہ گئی ہیں۔

افسانوں کے علاوہ مجموعے میں دو انشائیے بھی شامل ہیں۔ ان میں سے ایک انشائیہ 'سونٹے' میں نے گذشتہ صدی کی ساتویں دہائی میں ریڈیو کشمیر کی یو وانی سروس کے لیے قلم بند کیا تھا مگر اس کا مسودہ کہیں تلف ہو گیا۔ چنانچہ اس کا مرکزی خیال میرے ذہن میں موجود تھا اس لیے

میں نے اسے دوبارہ رقم کیا۔ دوسرے انشائیے کا تھیم حالات موجودہ سے جڑا ہوا ہے۔ چونکہ صوتی آلودگی ہمارے ماحول کے لیے بہت بڑا خطرہ بن کر سامنے آرہا ہے اس لیے اس پر دھیان دینے کی فوری ضرورت ہے۔ افسوس کہ ہمارے سیاست دان اس کا حل نکالنے کے بجائے اس پر اپنی سیاسی روٹیاں سینک رہے ہیں جبکہ ہمارے ملک کا ماحول روز بروز بگڑتا چلا جارہا ہے۔ دہلی کی تو یہ حالت ہے کہ ایک جانب سانس لینا مشکل ہورہا ہے اور دوسری جانب شور کے سبب کان پھٹے جارہے ہیں۔ مجھے امید ہے یہ دونوں کاوشیں قارئین کو پسند آئیں گی۔

آپ کی رائے کا ہمیشہ کی طرح انتظار رہے گا۔

دیپک بُدکی

وسندھرا غازی آباد۔۲۰۱۰۱۲

بتاریخ ۲۷/ مئی ۲۰۲۲ء

جرأتِ اظہار

موت کے سائے بڑھتے جا رہے تھے۔لوگ اپنے اپنے دڑبوں میں قید اس کا انتظار کر رہے تھے۔نہ جانے کب ہمارا بھی نمبر آئے گا، کِسے معلوم؟

ایسا پہلی بار ہوا ہوگا کہ ساری دنیا کا کاروبار ٹھپ پڑ چکا تھا۔کوئی قیاس بھی نہیں کرسکتا تھا۔

مال ویران، سڑکیں سنسان، سینما گھروں پر تالے، ہوٹلوں کی چھتوں پر جالے۔

سکول بند، آفس بند، کارخانے بند، ریل گاڑیاں بند، ہوائی جہاز بند۔

سب کچھ بند پڑا تھا۔کیوں......؟ آخر کیوں......؟

ماضی میں طغیانیاں آتی تھیں، وبائیں پھیلتی تھیں، جنگیں ہوتی تھیں، تہذیبیں مٹتی تھیں مگر مخرب قوتیں کسی خاص علاقے تک محدود رہتی تھیں اور تباہی مچا کر دم توڑتی تھیں۔تپ دِق اور پلیگ جیسی وباؤں کے بارے میں سن کر رونگٹے کھڑے ہوجاتے تھے۔اکیسویں صدی کا انسان قیاس بھی نہیں کرسکتا کہ بنی نوع انسان نے ان وباؤں کا سامنا کیسے کیا ہوگا؟ خاص کر اس زمانے میں جب سائنس ابھی گھٹنوں کے بَل چل رہی تھی اور ان وباؤں کے لیے کوئی علاج میسر نہ تھا۔شہر اجڑ جاتے، بستیاں ویرانیوں میں تبدیل ہوجاتیں اور انسان کیڑے مکوڑوں کی مانند پیوندِ خاک ہو جاتے۔لوگ جان بچانے کی خاطر اپنی آبائی جگہیں چھوڑ دیتے، کھیت کھلیان چھوڑ دیتے، گھر بار چھوڑ دیتے، اور غربت میں مزدوری کرنے پر مجبور ہوجاتے۔لیکن اب جو ہو رہا ہے اس کے بارے

میں کبھی کسی نے سوچا بھی نہ ہوگا۔ اب تو سائنس نے بہت ترقی کر لی ہے۔ خطرناک سے خطرناک بیماری کا مداوا ڈھونڈ لیا ہے۔ پھر یہ سب کیا ہو رہا ہے؟

ان سوالوں کا امر سنگھ کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ وہ صبح و شام اسی سوچ میں غرق رہتا مگر کہیں سے کوئی جواب نہیں مل رہا تھا۔

وہ خود سے پوچھتا۔ کیا یہ خدا کا قہر ہے جو زمین پر نازل ہوا ہے؟ یا انسان کے گناہوں کی سزا ہے؟

اس کا عقلیت پسند ذہن جواب دیتا۔ اگر خدا رحیم ہے تو پھر اس قہر کا کیا جواز ہے؟ اگر وہ کریم ہے تو پھر اپنی ہی مخلوق کو آزمانے کی کیا ضرورت ہے؟ اگر وہ غفار ہے تو انسان کو گناہوں کی سزا کیوں دے رہا ہے؟ کیا ایک سال کے ہلاک شدہ بچے نے بھی گناہ کیے تھے، اس کو کس پاداش میں سزائے موت ملی؟ دھیرے دھیرے وہ نہ جانے کس دنیا میں کھو جاتا۔

ایک خوردبینی وائرس نے عالم کا توازن بگاڑ دیا۔ نہ جاندار ہے اور نہ بے جان، دونوں کے درمیان انتہائی باریک کڑی ہے، جس نے سارے جہاں میں تہلکہ مچا دیا ہے۔ پروٹین کا ایک خفیف سا ذرّہ......! سمّی مادہ......! زہریلا اور جان لیوا......! دنیا کو تباہی کے دہانے تک پہنچانے والا۔ چین کے وُوہان شہر میں پیدا ہوئے اس وائرس کا نام بھی کل تک کوئی نہیں جانتا تھا۔ نئی دریافت......؟ یا پھر نئی ایجاد......؟ انسانی خرافات کا کیا ٹھکانہ۔ لیبارٹری میں کیا کچھ نہیں بن سکتا۔ تخریب پسند سائنس دانوں کا ذہن جب بُرے کاموں میں لگ جاتا ہے تو کیا کچھ ممکن نہیں ہوتا۔ ایٹم بم.... بمبار جہاز.... کیمیائی جنگ... پھر حیاتیاتی جنگ کیوں نہیں؟

نام رکھنے میں انسان کو مہارت حاصل ہے۔ وہ چاہے بیٹے یا بیٹی کا ہو، سڑک یا شہر کا ہو، عبادت گاہ یا مقبرے کا ہو، یا پھر کسی بیماری یا جرثومے کا ہو۔ کتنے جتن کیے گئے کہ اس وائرس کا نام کرن ہو، کوئی چینی وائرس تجویز کرنے لگا، کوئی ناول کورونا وائرس کہنے لگا اور کوئی کووِڈ-۱۹۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ ایک وائرس چند ہی دنوں میں ساری دنیا میں بادِ تند کی طرح پھیل گیا اور ہر سو آہ

وقفاً فوقتاً سنائی دے رہی ہے۔

امر سنگھ نے ایسی مہاماری کبھی سنی تھی نہ دیکھی۔ اس نے پچھتّر سالہ زندگی میں کئی اتار چڑھاو دیکھے تھے مگر کبھی گھبرایا نہیں۔ سینہ تان کر مقابلہ کرتا رہا۔ البتہ زندگی کے اس موڑ پر اسے ایسے امتحان سے گزرنا پڑے گا، اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔

ایک معمولی راجپوت گھرانے میں اس نے آنکھ کھولی تھی۔ والد ایک دکاندار کے پاس ملازمت کرتا تھا۔ ماں گرہستن تھی جس نے انتہائی غربت کے باوجود اپنے پتی سے کبھی کوئی شکایت نہیں کی۔ بہت قناعت پسند عورت تھی۔ ان کے علاوہ دو بہنیں اور دو بھائی تھے۔ روکھی سوکھی جو کچھ مل جاتی سبھی مل بانٹ کر کھا لیتے تھے۔ بھائی بہنوں میں غضب کا اتحاد تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ امر سنگھ کو پڑھنے لکھنے کا بہت شوق تھا لیکن بھائیوں نے میٹرک کر کے پڑھائی ترک کر لی اور بہنوں نے میٹرک کرنے میں بھی آنا کانی کر لی۔ خیر بہنیں تو شادی کر کے سسرال میں چولھا چوکا سنبھالنے میں مصروف ہو گئیں جبکہ بھائیوں نے جیسے تیسے معمولی سی سرکاری نوکریاں حاصل کر لیں، شادیاں کر لیں، بچے پیدا کر لیے اور مزید کچھ اور سوچنے کی کوشش نہیں کی۔ امر سنگھ کی بات ہی کچھ اور تھی۔ وہ بچپن ہی سے اُولوالعزم تھا، بڑے بڑے خواب دیکھنا اس کی طبیعت ثانی بن چکی تھی۔ میٹرک پاس کیا، پھر بی کام کیا اور اس کے بعد بزنس منیجمنٹ کا کورس کر لیا۔ اسپارٹا کمپنی میں بحیثیت مارکیٹنگ منیجر کے نوکری شروع کی اور آہستہ آہستہ ترقی کے زینے چڑھتا ہوا اسی کمپنی کا منیجنگ ڈائریکٹر بن گیا۔ اس بلندی پر پہنچنے کا تو اس نے خواب بھی نہ دیکھا تھا تاہم حقیقت یہی تھی اور وہ قدرت کی ان مہربانیوں کے لیے ہمیشہ شکرگزار رہتا۔ زندگی کے اس لمبے سفر میں اس نے بہت کچھ پایا بھی اور کھویا بھی۔ ایک دولتمند لڑکی سے ازدواجی رشتہ قائم کر لیا، بیوی تعلیم یافتہ تھی اور ایک پرائیویٹ کمپنی میں ملازم۔ اس کے بطن سے ایک لڑکی اور ایک لڑکا پیدا ہوا تھا۔

اپنوں کے لیے اس نے بہت کچھ کیا۔ ماں باپ کی آخری سانس تک ان کی خدمت کی۔ والدین اور بہن بھائیوں کے لیے ایک اچھا سا گھر بنوایا۔ بہنوں کی شادیاں اچھے گھروں میں کیں۔

ان کی ڈولی کے ساتھ ڈھیر سارا جہیز بھیج دیا۔ بھائی چنانچہ معمولی سرکاری ملازم تھے اور ان کی کمائی قلیل تھی، اس لیے ان کی گاہ بہ گاہ مالی امداد کرتا رہا تاکہ ان کے بال بچے علم کی دولت سے سرفراز ہوں۔ شادی کے بعد بھی وہ ان کی کسمپرسی سے غافل نہیں رہا۔ پھر شادی کر کے اپنے کنبے کی طرف دھیان دینے لگا۔ ایک عالیشان گھر دہلی کی پوش کالونی گریٹر کیلاش میں بنوایا۔ بچوں کو بہترین پبلک سکول میں ایڈمشن دلوایا اور دونوں نے بہت اچھے مارکس لے کر پیشہ ورانہ کالجوں میں داخلہ لیا۔ بیٹی انجینئر بن گئی اور ایک ہم جماعت کے ساتھ شادی کر کے کینیڈا چلی گئی۔ بیٹے نے انجینئرنگ اور پھر ایم بی اے کر کے اپنی بزنس شروع کی جس میں وہ کامیاب رہا۔ روپے پیسے کی کبھی کوئی تنگی محسوس نہ ہوئی۔ خود تو گریٹر کیلاش میں رہتا ہی تھا، بیٹی کے لیے بھی نزدیک ہی ایک اچھا سا فلیٹ خرید کر رکھ دیا۔ کیا معلوم کب واپس آنا پڑے، پھر کہاں رہے گی؟ کچھ پراپرٹی تو اپنے دیس میں ہونی چاہیے۔ بڑا دور اندیش تھا۔ لڑکی جب بھی اپنے بال بچوں کے ساتھ ہندوستان آتی تو اپنے ہی فلیٹ میں رہتی ورنہ وہ سال بھر خالی رہتا۔ بڑی بڑی کمپنیوں میں شیئر بھی خرید لیے تھے جن کے دام بڑھتے بڑھتے آسمان کو چھونے لگے تھے۔ کبھی کبھار اپنے پورٹ فولیو پر نظر ڈالتا تو خود پر رشک کر لیتا۔

صرف ایک حادثے نے اس کو جھنجھوڑ دیا تھا۔ بیوی کی ہم سفری زیادہ دیر قائم نہ رہ سکی۔ پینتالیس برس کی تھی کہ رحم کے کینسر نے آدبوچا اور اس کی جان لے لی۔ بڑے سے بڑے آنکولوجسٹ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ گئے۔ تب سے امر سنگھ اکیلا پڑ گیا۔ گھر میں بیٹا تھا، بہو تھی، ان کے بچے تھے پھر بھی امر سنگھ کے وجود میں پیدا ہوئے خلا کو کوئی پُر نہ کر سکا۔ وہ اپنے کمرے میں الگ تھلگ رہتا، خود سے باتیں کرتا، اپنے ماضی کو یاد کر کے ایک ایک پل بتاتا۔ ہر دم یہی دعا کرتا کہ وہ کسی بڑی بیماری میں مبتلا نہ ہو بلکہ ہنستے کھیلتے اس دنیا سے اٹھ جائے۔

دو مہینے قبل اس کو اپنی بیٹی یاد آ گئی۔ بیٹی نے کینیڈا بلایا اور اس نے جلدی سے ہاں کر دی۔ تقریباً ایک مہینہ وہاں پر گزار دیا۔ اسی دوران ہر طرف شور وغل مچ گیا کہ چین سے ایک مہلک

وائرس سرحدیں پھلانگتا ہوا دنیا کے ہر کونے میں پھیلتا چلا جارہا ہے اور ہزاروں جانیں تلف ہو رہی ہیں۔ امر سنگھ کو اپنے گھر کی یاد ستانے لگی۔ وہ گھر سے دور پردیس میں مرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے بیٹی سے درخواست کر کے واپسی کی ٹکٹ کروائی۔ اس وقت تک لاک ڈاؤن کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا۔ بیٹی کے گھر میں جب تک تھا ہشاش بشاش تھا مگر خدا جانے کہاں - ایئر پورٹ، ریستوران یا پھر ہوائی جہاز میں- کہیں نہ کہیں اس کے بدن میں متعدی وائرس سرایت کر گیا اور اس کو پتا بھی نہ چلا۔ نئی دہلی ہوائی اڈے پر پہنچا تو اس کی چیکنگ ہوئی اور اس کو کورونا پوزیٹو پایا گیا۔ پھر کیا تھا، حفاظتی عملے نے اس کو گھر جانے سے روک دیا اور سیدھے رام منوہر لوہیا ہسپتال کے آئسولیشن وارڈ میں پہنچا دیا۔

ایک دو روز اس کی حالت معمول کے مطابق رہی۔ بس یہی ہلکا سا بخار اور تھوڑی سی کھانسی۔ پھر دھیرے دھیرے حالت بگڑنے لگی۔ اب تو اسے سانس لینے میں بھی تکلیف ہو رہی تھی۔ ہسپتال کے ڈاکٹر اور نرسیں بہت کوشش کر رہے تھے کہ اس کی صحت بحال ہو۔ چونکہ اس بیماری کی کوئی مخصوص دوائی دستیاب نہ تھی، اس لیے ڈاکٹر ملیریا اور فلو کی آزمودہ دوائیاں مریضوں پر آزما رہے تھے۔ کچھ مریضوں پر ان کا اثر دکھائی دینے لگا۔ بہت سارے نوجوانوں کی صحت بحال کرنے میں ڈاکٹر کامیاب ہو گئے مگر کئی عمر رسیدہ مریض اس وائرس کے باعث زندگی کی جنگ لڑتے لڑتے ہار گئے۔

اُدھر ہسپتال کا منظر دل شکن تھا۔ ہر طرف بھاگ دوڑ ہو رہی تھی اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ ہسپتال پر کوئی سماوی آفت آچکی ہے۔ ڈاکٹروں اور نرسوں کے چہرے پریشانی کے اشتہار بن چکے تھے۔ دوسری طرف وہ ملازم بھی تھے جو صفائی اور دیگر کاموں میں جٹے ہوئے تھے۔ سبھی ایسے حفاظتی لباس میں ملبوس تھے جیسے کسی آئی سی یو میں مریضوں کی دیکھ بھال کے لیے تعینات ہوں۔ انہیں خود بھی اس مہلک بیماری سے بچنے کی تدابیر کرنی پڑ رہی تھیں۔ اس کے باوجود وہ میدان جنگ میں سینہ تان کر کھڑے تھے۔

منتظمین، ڈاکٹروں اور نرسوں کو جب کبھی اور جہاں کہیں بھی تھوڑی سی فرصت مل جاتی، اس وبا کے بارے میں غیر رسمی طور پر چرچا کرتے اور اس سے نپٹنے کے طریقے تلاش کرتے۔ وارڈوں میں...، کاریڈوروں میں...، مشاورتی کمروں میں....غرض ہر طرف دو چار بندے آپس میں خیالات کا تبادلہ کرتے نظر آتے۔

امر سنگھ کے بیڈ سے تھوڑی دوری پر ایک ڈاکٹر دوسرے ڈاکٹر سے کہہ رہا تھا۔ ''اِدھر ہسپتال میں آئی سی یو اور وینٹی لیٹروں کی کمی پڑ رہی ہے، اُدھر مریض ایک کے بعد ایک لائے جا رہے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا کریں؟''

دوسرے نے جواب دیا۔''ہاں ،تیمار داروں کے لیے پرسنل پروٹیکٹیو ایکیوپمنٹ(PPE) بھی کم پڑ رہے ہیں۔ یہاں تک کہ ماسک (Mask) بھی اب دستیاب نہیں ہیں۔اس وبا کا کسی کو گماں بھی نہ تھا۔''

''سر، سننے میں آیا ہے کہ کیرالا میں ایک ڈاکٹر اور سسٹر کو بھی کورونا ہو گیا ہے۔'' ایک نرس نے، جو ساتھ ہی میں کھڑی تھی، دونوں کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''یہ وقت ہمارے امتحان کا ہے سسٹر، ہمیں کم سے کم حفاظتی سامان سے گزارا کرنا پڑے گا اور مریضوں کو بچانے کی مسلسل کوشش کرنی پڑے گی۔'' پہلے ڈاکٹر نے جواب دیا۔

''یس یو آر رائٹ، ڈاکٹر کو ایسے ہی موقعوں پر اپنی زندگی کی فکر کیے بغیر مسیحا کا روپ دھارن کرنا پڑتا ہے۔'' دوسرے نے جواب دیا۔

پھر تینوں تین دِشاؤں میں چلے گئے اور اپنے اپنے کام میں جٹ گئے۔

امر سنگھ نے ان کا یہ مکالمہ سن لیا۔اس کی آنکھوں کے سامنے موت کا خوفناک منظر ابھر آیا۔اسے محسوس ہو رہا تھا کہ مریضوں کا کارواں- بوڑھے، جوان، مرد اور عورتیں، اپنی انتم یاترا پر چلے جا رہے ہیں اور وہ بھی ان میں شامل ہے۔وہ بہت پریشان ہو گیا۔لاک ڈاؤن اور کوارنٹائن کی وجہ سے اس کے گھر کا کوئی بھی فرد اسے ملنے ہسپتال نہیں آسکا۔آتا بھی کیسے؟ یہ متعدی بیماری تھی،

بیمار کے نزدیک آنے یا اس سے بات کرنے سے منا ہی تھی۔

اسے پہلی بار محسوس ہوا کہ انسان تنہائی کا پُتلا ہے۔ وہ دھرتی پر اکیلا آتا ہے اور اکیلے ہی پرلوک سدھار جاتا ہے۔

جذبات کی رو میں بہہ کر وہ اپنے ماضی کو کریدنے لگا۔ ''زندگی بھر دولت جمع کرتا رہا۔ ماں باپ اور بھائی بہنوں کی ہر ضرورت پوری کر لی، ان کے لیے گھر بنوایا، بیٹے کے لیے بنگلہ بنوایا، بیٹی کے لیے فلیٹ خریدا، مالی تحفظ کے لیے کئی کمپنیوں میں شیئرس خرید لیے، بیشتر سکھ سویدھائیں سب کو میسر رکھ دیں.... آخر کس کے لیے؟ اپنے بال بچوں کے لیے...! مجھے کونسا اپنے ساتھ پرلوک میں لے جانا تھا۔ مگر دیکھو اس کے بدلے مجھے کیا ملا؟ ہسپتال میں میرے داخلے کی خبر ان کو فوری طور دی گئی، میں نے خود موبائیل پر اپنے بیٹے کے ساتھ بات کر لی مگر ان میں سے کوئی مجھ سے ملنے نہیں آیا یہاں تک کہ کسی نے ہسپتال تک آنے کی بھی جسارت نہیں کی۔ کیسی ستم ظریفی ہے یہ کہ وقت ضرورت میرے پاس کوئی بھی نہیں! اس وبا نے سبھی رشتے ناتے بے نقاب کر دیے۔ کورونا وائرس نے ہم سب کو آئینہ دکھا دیا۔ میرے جیسے ہر مریض کو اکیلے پن کا شدید احساس ہو رہا ہوگا۔''

کچھ وقفے کے بعد اس نے اپنے سر کو جھٹک کر منفی خیالات کو خارج کرنے کی شعوری کوشش کی۔ اس کے درون سے آواز آئی۔ ''ایسی توقعات بے جا ہیں۔ یہ وبا ہی کچھ ایسی ہے کہ انسان مجبور ہو رہا ہے۔ رشتے دار لاکھ چاہیں کہ وہ بیمار کی تیمار داری کریں، کر نہیں سکتے کیونکہ سارا خاندان بیماری میں مبتلا ہو کر نیست و نابود ہو جائے گا۔ نہ ان کو تیمار داری کی تربیت ہے اور نہ ان کے پاس حفاظتی ساز و سامان ہے۔ یہ تو سیدھے موت کے منہ میں جانے کے مترادف ہوگا۔ اس کے باوجود دیکھ لو، اپنے نہیں تو پرائے انسان کے کام آ رہے ہیں۔ کتنے ڈاکٹر اور نرسیں اپنی زندگی داؤ پر لگا کر مریضوں کی دیکھ بھال کر رہے ہیں۔ دن کو دن اور رات کو رات نہیں سمجھتے۔ ان کو دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ انسانیت مر چکی ہے۔ یہ لوگ تو فرشتے ہیں فرشتے۔''

سورج ڈھلتے ہی امر سنگھ کو سینے میں شدید درد اٹھا اور جکڑن سی محسوس ہوئی۔ وہ کھانسنا چاہتا تھا مگر کھانس نہیں پا رہا تھا۔ چند منٹوں میں ڈاکٹر حاضر ہوا۔ اس نے نرس سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''سسٹر تم کہیں سے بھی وینٹی لیٹر کا انتظام کرلو۔ مریض کی حالت نازک ہو رہی ہے۔ اس کو آکسیجن کی سخت ضرورت ہے۔''

''سر، ہسپتال میں جتنے بھی وینٹی لیٹر تھے سب کے سب سنگین مریضوں کو لگائے گئے ہیں، اب تو کوئی اور وینٹی لیٹر دستیاب نہیں ہے۔ پھر بھی میں ڈھونڈ ڈھانڈ کر کہیں سے بندوبست کر لوں گی۔'' وہ مڑ کر جانے والی تھی کہ امر سنگھ نے ہاتھ کے اشارے سے اس کو روکا اور پھر ڈاکٹر سے مخاطب ہوا۔

''ڈاکٹر صاحب، آپ میری چنتا نہ کریں، کوئی دوائی دے دیں تاکہ میں سینے میں اٹھے درد کو سہہ سکوں۔ مجھے وینٹی لیٹر کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے زندگی کے پچھتّر سال گزارے ہیں۔ خوبصورت بہاریں بھی دیکھی ہیں اور اجاڑ خزائیں بھی۔ پچھتّر سال کچھ کم نہیں ہوتے ڈاکٹر صاحب۔ آپ وینٹی لیٹر کسی نوجوان کی زندگی بچانے میں استعمال کرلیں جس نے ابھی زندگی دیکھی نہ ہو، جس کے خواب ابھی ادھورے رہ گئے ہوں۔ بہتر یہ رہے گا کہ وینٹی لیٹر آنے والی نسل کے لیے استعمال کریں۔ میرا کیا ہے میں تو اپنی زندگی جی چکا ہوں۔ مجھے یوں لگے گا کہ مجھے زندگی میں کوئی نیک کام کرنے کا موقع مل گیا۔''

حالانکہ ڈاکٹر نے اس کو سمجھانے کی بہت کوشش کی مگر وہ اپنی ہٹ پر قائم رہا۔ آخرکار اس نے امر سنگھ کو سکون آور انجکشن تجویز کی جو نرس نے اس کے بازو میں لگا دیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ آس پاس کی دنیا سے غافل ہو گیا۔

صبح سویرے جو نرس نے راؤنڈ لگایا تو دیکھا کہ امر سنگھ کی روح پرواز کر چکی ہے۔ اس کی لاش بے حس و حرکت ہسپتال کے بیڈ پر پڑی ہوئی تھی۔ ان ہنگامی حالات میں وائرس سے فوت شدہ مریضوں کے داہ سنسکار کی ذمے داری سرکار نے خود ہی لے لی تھی۔ تاہم دستور کی خاطر امر سنگھ

کے بیٹے کو خبر کر دی گئی مگر لاش اس کے حوالے نہیں کی گئی۔ مردے کو ہسپتال کی ایمبولنس میں شمشان گھاٹ پہنچایا گیا اور وہاں برقی لاش بھٹی میں رکھ کر نذر آتش کر دیا گیا۔

شمشان کے احاطے میں بیٹا حاضر تو تھا مگر اس کو لاش کے نزدیک جانے یا اسے چھونے کی اجازت نہیں ملی۔

تیرا سچ، میرا سچ

''تم کیا سمجھتے ہو کہ لکھاری ہونے کے سبب تم جو کچھ لکھو گے وہی حتمی سچ ہے؟'' اسے کسی عورت کی آواز سنائی دی۔ دراصل یہ آواز اس کے درون سے آرہی تھی اور اس کی شریکِ حیات کی آواز سے ملتی جلتی تھی۔ دفعتاً اس کے ہاتھ سے قلم چھوٹ کر زمین پر گر گیا لیکن آواز پھر بھی سنائی دے رہی تھی۔ ''ہاتھ میں قلم کیا تھاما ہے تم نے تو ذہنی توازن ہی کھو دیا ہے۔ لگتا ہے مبالغہ آرائی تم جیسے قلم کاروں کا پیدائشی حق ہے۔''

''تم غلط سوچ رہی ہو۔ میں جو صحیح سمجھتا ہوں وہی لکھتا ہوں۔ میری نگارشات میں معروضیت ہوتی ہیں۔ ان میں میرا تجربہ، میرا مشاہدہ اور میری دقیقہ شناسی شامل ہوتی ہے۔''

''ہاہاہا... معروضیت... یا... نرینہ عصبیت کی ترجمانی...! حق ملکیت جتانے والے مرد کا پوشیدہ روپ...! تمھیں عورت کے ہر عضو کو چٹخارے لے لے کر بیان کرنے کا حق حاصل ہے اور اس پر تم فخر کرتے ہو۔''

''تم بھی تو قلم کار ہو۔ ایک ذہین دماغ رکھتی ہو۔ تمھارے ہاتھ میں بھی قلم ہے، پھر تمھیں کس نے روکا ہے؟''

''میں ایک عورت ہوں۔ چاہے جتنا بھی چاہوں کہ اپنے خیالات کو بے لاگ و لپیٹ قرطاس پر انڈیل دوں پھر بھی مجھے اپنی حد بندی کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ میں مرد اساس سماج میں رہتی ہوں جو مجھے اجازت نہیں دیتا۔ انھوں نے میرے حدود کا تعین حجری عہد میں دائمی طور پر کر دیا

ہے۔ پھر بتاؤ کیا لکھوں .... تمھارے اور اپنے بارے میں .... ان لمحات کے بارے میں جو تم نے میرے ساتھ مختلف شبستانوں میں گزارے یا پھر ان لمحات کے بارے میں جو تم نے کہیں اور کسی دوسری عورت کی آغوش میں گزارے۔ میں ترستی رہتی، چھت کی کڑیاں گنتی رہتی، سوچتی رہتی کہ اب آئے گا، تب آئے گا مگر تمھارا کہیں اتا پتا ہی نہیں ملتا تھا۔ جب انتظار کرتے کرتے تھک جاتی تو خود بخود آنکھ لگ جاتی۔ میں کملا داس کی طرح بستر مرگ پر تو ہوں نہیں کہ اپنی کہانی یہ سوچ کر لکھوں کہ اگر بدنامی و رسوائی ہو بھی جائے تو میرا کیا جاتا ہے، میں اس کو دیکھنے یا سننے کے لیے زندہ نہیں رہوں گی۔ بے چاری کملا داس نے اپنی خود نوشت 'میری کہانی' اسی خیال سے قلم بند کی تھی کیونکہ اسے لگ رہا تھا کہ وہ آخری بار دنیا کو دیکھ رہی ہے اور پھر کبھی نہ دیکھ پائے گی۔ لیکن اس کے بعد معجزہ ہوا۔ وہ بستر مرگ سے صحتیاب ہو کر اٹھی، کئی برس زندہ رہی اور ہر پل اجنبی لوگوں کی طلبگار دستکوں کا سامنا کرتی رہی۔ اسے ہر موڑ پر طعنے سننے پڑتے تھے، ہر نگاہ اس پر خریدار کی طرح اٹھتی تھی جیسے وہ کوئی جسم فروش ہو اور ہر ایرے غیرے کی خواہش پوری کرنے کے لیے جی رہی ہو۔ اسے اپنے وجود سے نفرت ہونے لگی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے سماج کا سامنا کرنا پڑا، اسی سماج کا جس کے آگے وہ کالے حروف کا پیرہن پہن کر عریاں گھومنے کی متمنی تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ کاش وہ اپنے بدن کے سبھی اعضا کاٹ کر ان کا کولاج بنا سکے اور لوگوں کے دیکھنے کے لیے اس کولاج کی نمائش لگا سکے۔ مگر میں .... میں کملا داس نہیں ہوں۔ میں میں ہوں، مجھ میں اتنی ہمت اور قوت نہیں ہے کہ لوگوں کی باتیں سن سکوں، لوگ طعنے دیتے رہیں اور میں ان سنی کر لوں۔ مجھے اپنی بیڑیوں کا پورا احساس ہے۔ ایک عورت کتنی کمزور ہوتی ہے اس کا احساس مجھے ہمیشہ رہا ہے۔''

''تو پھر کیا ضروری ہے کہ تم اپنی کہانی لکھ دو۔ تم یوں ہی عام خواتین کی طرح گھٹ گھٹ کر جی سکتی ہو۔ موت تو خیر ایک دن آئے گی ہی۔ بہتر یہی ہے کہ اس کا انتظار کر لو۔ مگر میں .... میں تو اپنی کہانی لکھوں گا اور مجھے کوئی نہیں روک سکتا۔''

اور پھر مہتاب راہی اپنی کہانی رقم کرنے لگا۔

مہتاب راہی کی کہانی طویل ہے مگر یہاں پر اس کا لبِ لباب پیش کرنا کافی ہے۔ وہ ایک متوسط گھرانے کا فرد تھا جسے طالب علمی کے زمانے ہی میں انگریزی اور اردو لٹریچر کا شوق پیدا ہو گیا۔ جہاں کہیں بھی کوئی ناول یا افسانوی مجموعہ مل جاتا فوراً اسے پڑھ لیتا۔ والدین کی آرزو تھی کہ مہتاب انجینئر بن جائے مگر وہ کورس کی کتابیں کم اور اپنی پسندیدہ ادبی کتابیں زیادہ پڑھ لیتا تھا ۔انجام کار اسے سائنس اسٹریم سے کنارہ کرنا پڑا اور آرٹس اسٹریم میں داخلہ لینا پڑا۔ یہاں تو اس کی شخصیت خوب نکھر آئی، بی اے اور ایم اے کے امتحانوں میں فرسٹ ڈویژن میں کامیابی حاصل کر لی۔ ادبی محفلوں میں شرکت کرنے لگا اور اپنی تحریروں سے لوگوں کے دل جیتتا رہا۔

ایسی ہی ایک محفل میں اس کی جان پہچان رُپالی سے ہوئی۔ وہ شاعرہ تھی اور اپنے کلام و لہجے سے حاضرین کو محظوظ کرنے میں کامیاب ہوتی تھی۔ ناک نقشے سے بہت خوبصورت تھی۔ اسٹیج پر جب جلوہ گر ہوتی تو ایسے لگتا تھا کہ کوئی بجلی سی چمک اٹھی ہو۔ درمیانہ قد، شانوں پر گرتے ہوئے سیاہ بال، موٹی چمکیلی آنکھیں، سرخ لب اور متناسب بازو جن کو وہ شعر کہتے ہوئے ہوا میں لہراتی تھی۔ ہال میں تالیوں اور لفظ 'مکرر' کی گونج بار بار سنائی دیتی تھی۔ مشاعرہ ختم ہوتے ہی دونوں اتفاق سے ملے اور باہم ایک دوسرے میں دلچسپی ظاہر کرنے لگے۔ پھر کئی ملاقاتیں ہوئیں اور آخر کار دونوں نے آپس میں شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ دونوں ایک دوسرے کی محبت میں اتنے غرق ہو گئے کہ فیصلہ لینے سے پہلے انھوں نے ایک دوسرے کی امیدوں، تمناؤں اور توقعات کے بارے میں پوچھا ہی نہیں۔ انھوں نے اس بارے میں ایک دوسرے سے تبادلۂ خیال کرنا بھی مناسب نہ سمجھا۔ مستقبل کے بارے میں کون کیا سوچتا ہے اس تعلق سے کبھی کوئی گفتگو نہ ہوئی۔ جسم ذہن پر بھاری پڑ گیا اور شادی بڑی دھوم دھام سے رچائی گئی۔

شادی کیا ہوئی گھر مسابقتی اکھاڑہ بن گیا۔ ایک زیریں لہر تھی جو اندر ہی اندر دوڑ رہی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش کرنے لگے۔ دونوں ادبی محفلوں میں واہ واہ بٹورتے رہے اور ایک دوسرے کو یہ دکھانے میں مصروف رہے کہ بازار میں اس کی مانگ زیادہ

ہے۔دوسری جانب دونوں سرکاری ملازم بھی ہو گئے اور مالی طور پر آزادی محسوس کرنے لگے۔

رُپالی اپنی جوانی کوطویل تر کرنا چاہتی تھی۔اس نے یک طرفہ فیصلہ کرلیا کہ وہ آئندہ دس برس تک بچے نہیں جنے گی۔احتیاط کے طور پر اس نے ڈاکٹر سے صلاح مشورہ کر کے اس سمت میں ضروری اقدامات اٹھائے۔مہتاب راہی کو پہلے تو اس بارے میں کچھ بھی معلوم نہ ہوا لیکن کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد رُپالی نے اسے حقیقت سے روشناس کرایا۔یہ خبر سن کر مہتاب کے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔اس نے اپنے مستقبل کے لیے بہت سارے خواب سجائے تھے .....ایک سندر سا گھر...، خوبصورت بیوی...، ننھے منے بچے .....اسے اور کچھ نہیں چاہیے تھا۔اس کے برعکس وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ گھر میں عجیب سا تناؤ پیدا ہو گیا۔بس ڈائننگ ٹیبل پر ایک دوسرے کا سامنا ہو جاتا ورنہ دونوں ایک دوسرے سے پہلو بچاتے رہتے۔دن دوستوں کے ساتھ گزرتے اور راتیں تنہائی میں۔

انجام کار دونوں ایک دوسرے سے الگ ہو گئے ۔ رُپالی نوکری کے ساتھ ساتھ مشاعرے لوٹتی رہی جبکہ مہتاب رائے کی نثری تصانیف کو ادبی حلقوں میں خوب سراہا جانے لگا۔بہر حال دنیا ان کے وجود کے خلا سے لاعلم تھی۔اپنے اندر کی بے چینی کو مہتاب راہی نے نچوڑ کر صفحۂ قرطاس پر بکھیرنا شروع کر دیا۔جوں جوں وہ لکھتا رہا اس کے من کا بوجھ ہلکا ہوتا رہا۔اس نے اپنی خودنوشت میں ان لمحات کو قید کیا جنھوں نے اس کے جذبات کو نہ صرف انگیز کیا تھا بلکہ ٹھیس بھی پہنچائی تھی۔

رُپالی نے خودنوشت تو نہیں لکھی مگر اس کی شاعری میں ہجر کی تڑپ ،تنہائی کی بے بسی اور مستقبل کی غیر یقینیت جھلکنے لگی۔اب تو وہ پختہ مشق شاعر بن گئی تھی ۔مشاعروں میں سامعین کی واہ واہ سن کر اس کا دل بلیوں اچھلتا تھا مگر جب وہ گھر لوٹ آتی تو دیواریں کاٹنے کو دوڑتیں اور گھر سونا سونا سا لگتا کیونکہ وہاں پر کوئی بات کرنے کے لیے منتظر نہ تھا۔جس مرد سے دوستی ہو جاتی وہ صرف اس کے جسم کا شیدائی نظر آتا،کوئی زندگی بھر کا ساتھ دینے کو تیار نہ تھا۔اِدھر عمر بھی لمبے لمبے

ڈگ بھرتی جارہی تھی۔ بالوں میں سفید تار نظر آنے لگے جنھیں وہ ہر روز سیاہ کرنے میں جٹی رہتی تاکہ جوان دکھائی دے مگر ڈھلتی عمر کو لاکھ چھپا کر بھی چھپایا نہیں جاسکا۔ دوست اس کی قربت تو چاہتے تھے، اس کی تعریفیں کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے تھے لیکن سہارا دینے کو کوئی تیار نہ تھا۔

کئی بار اس نے بھی سوچا کہ اپنی زندگی کی کہانی رقم کرے اور وہ سب تجربات قلم بند کرے جن سے وہ گزر چکی تھی مگر پھر خیال آتا کہ وہ اپنا پورا سچ تو نہیں لکھ پائے گی، اس پر جو کچھ بھی بیتی وہ جوں کا توں رقم نہیں کر پائے گی کیونکہ وہ ایک عورت ہے اور سماج میں اس کی عزت ہے۔ وہ اپنے معاشقوں کے بارے میں اس لاتعلقی سے نہیں لکھ سکے گی جس لاتعلقی سے مہتاب راہی نے اپنی خودنوشت میں بیان کیے تھے۔ اس نے تو عیش وعشرت کے ہر واقعے کو من وعن بیان کیا تھا۔ کس حسینہ کے ساتھ اس کا معاشقہ تھا، کس کے ساتھ وہ اٹھا بیٹھا، کس کے ساتھ اس نے جسم کی گرمی بانٹی، وہ سب کچھ اس نے قلم بند کیا تھا۔ ایسی بے باکی تو رُپالی کے لیے ناممکن تھی، وہ نہ تو اپنے عاشقوں کے نام گنا سکتی تھی اور نہ ہی ان کے ساتھ بتائے ہوئے لمحوں کو بیان کر سکتی تھی۔ زندگی کے مزے تو اس نے بھی لوٹے تھے مگر دنیا ان سے آگاہ نہیں تھی۔ اور اگر وہ یہ سب نہیں لکھ سکتی تھی تو اس کی زندگی میں لکھنے کو اور کیا رہ گیا تھا۔ باقی ماندہ زندگی تو عامیانہ تھی، اس میں قارئین کو کیا دلچسپی ہوسکتی تھی۔ دراصل مرد کے لیے ایسے واقعات فتوحات سے کم نہیں ہوتے جبکہ عورت کے لیے وہ ہزیمت کا موجب بن جاتے ہیں۔

دیکھا جائے تو مہتاب راہی نے بھی پورا سچ رقم نہیں کیا تھا۔ اس نے بھی مصلحتاً ایسی باتیں نہیں لکھی تھیں جن سے اس کی شخصیت پر آنچ آجاتی۔ آخر کمزوریاں تو سبھی لوگوں میں ہوتی ہیں۔ یہاں تو عدالتوں میں مقدس کتابوں پر ہاتھ رکھ کر بھی لوگ جھوٹ بولتے ہیں۔ اس نے تو کسی مقدس کتاب پر ہاتھ بھی نہیں رکھا تھا۔

مہتاب راہی کا ادھورا سچ اس کی خودنوشت میں بند ہوگیا جبکہ رُپالی کا سچ اس کے من میں ہی دب کر رہ گیا۔ انسانوں کے اس سمندر میں کسی نے ان کی طرف دھیان ہی نہیں دیا۔

☆☆☆

بے نام سُورما

کسی کے گماں میں بھی نہ تھا کہ ایسے بھی دن آئیں گے۔ دنیا تعطل کا شکار ہو جائے گی۔ سب کچھ رُک جائے گا۔ بالکل ٹھہر جائے گا۔ نہ کاروبار اور نہ ہی روزگار۔ لوگ اپنے گھروں میں دبک کر بیٹھ جائیں گے۔ صرف زندہ رہنے کی سبیلیں کریں گے۔ دیکھتے ہی دیکھتے کووڈ-۱۹ نے ساری دنیا اجاڑ دی۔ مشرق... مغرب... شمال... جنوب....! دنیا میں کوئی ایسی جگہ باقی نہیں بچی جہاں کورونا وائرس چند ہی مہینوں میں نہیں پہنچا۔ کروڑوں افراد اس وبا میں مبتلا ہو گئے اور کئی لاکھ فوت ہو گئے۔

ڈاکٹر پارکر اسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا کہ ایسا کیونکر ہو گیا؟ کہاں تو انسان نے اتنی ترقی کی کہ ساری دنیا عالمی گاؤں بن کر رہ گئی۔ دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک جانا اتنا آسان ہو گیا کہ پہلے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ انسان تعلیم اور روزگار کے وسیلے ڈھونڈنے کے لیے مشرق سے مغرب کی طرف بڑی آسانی کے ساتھ جانے لگا۔ سائنس نے دوریاں مٹا کر رکھ دیں اور انسان کو انسان کے قریب لانے میں کامیاب ہو گئی۔ انسان چاند پر ہی نہیں مریخ تک جا پہنچا۔ آدم زاد اپنی ان حصولیابیوں پر ناز کرنے لگا۔ خطرناک بیماریوں کے لیے دوائیاں ایجاد کی گئیں۔ تپ دق، پولیو، ملیریا، طاؤن، ہیضہ... ان سب وباؤں کا نام و نشان مٹ گیا۔ آدمی کی اوسط عمر کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ اب نہ تو عورتیں زچگی کے سبب مرتی ہیں اور نہ بچے ناقص غذا کے باعث۔ پھر یہ بلا کہاں سے آئی؟ انسان سے ایسی کون سی چوک ہو گئی کہ وہ جینے کے لیے ترسنے لگا۔ حیرانی تو اس بات کی

ہے کہ چین نے اس بارے میں دنیا کو بے خبر رکھا حالانکہ یہ وائرس چین کے شہر وُہان میں کئی مہینوں سے تباہی مچا رہا تھا۔ کہتے ہیں ناں کہ ہم تو ڈوبے ہیں صنم، تم کو بھی لے ڈوبیں گے۔ عالمی بھائی چارہ کتابوں میں قید ہو کر رہ گیا۔ اقوام متحدہ اور عالمی ادارۂ صحت ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھے رہے۔

ڈاکٹر پارکر نے کچھ وقفے کے بعد اپنے ذہن کو جھٹک کر انسانی تخریب کی صورتحال پر غور کیا۔ اسے جہاں انسان کے تعمیری ذہن پر فخر محسوس ہو رہا تھا وہیں وہ انسانی تخریب پر مایوس ہو گیا۔ نیوکلیائی ممالک کی باہمی ریس نے انسان کا جینا حرام کر دیا ہے۔ جوہری بم، برق رفتار جنگی جہاز، جدید ترین ہائی ٹیک ہتھیار، بین براعظمی بیلسٹک میزائل... یہ سب کس کے لیے بنائے جا رہے ہیں؟ غریب ملکوں میں رہنے والے نہتے معصوم لوگوں کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کے لیے...! یا پھر دنیا میں اپنی برتری قائم رکھنے کے لیے...! اس کے باوجود انھیں اتنا کچھ کافی نہیں لگتا۔ اب تو بات حیاتیاتی جنگ پر پہنچ گئی ہے۔ اب تجربہ گاہوں میں سمّی وائرس پیدا کیے جا رہے ہیں جو پھیل کر جوہری بموں سے بھی زیادہ تباہی مچا سکتے ہیں۔ تعجب تو اس بات کا ہے کہ اس تخریبی کارروائی میں حصہ لینے والے فریقین دونوں طرف سے ایک ہی راگ الاپتے ہیں کہ ان کی کوشش دنیا میں امن بحال کرنے کی ہے اور ان لوگوں کو نیست و نابود کرنے کی جو دنیا میں عدم استحکام پھیلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ دونوں کی اپنی اپنی دلیلیں ہیں اور دونوں کے اپنے اپنے معتقد ہیں جو ان کی دلیلوں سے مطمئن ہیں۔ ان براہین کے درمیان انسانیت شرمسار ہو رہی ہے۔

بہت روز پہلے وزیراعظم نے لاک ڈاؤن کا اعلان کر دیا۔ کاروباری ادارے، مال، دکانیں، تعلیمی ادارے، ذرائع نقل و حمل، ریل گاڑیاں اور دیسی و بدیسی ہوائی جہاز سب بند کر دیے گئے۔ یہ کارروائی اتنی جلدی ہوئی کہ دور شہروں میں کام کرنے والے دہاڑی مزدور سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ ان کا گزارا کیسے ہوگا۔ کچھ روز تو صبر کر لیا مگر پھر بھوک ستانے لگی۔ خود شاید کچھ اور دن سہہ لیتے مگر نڈھال بیوی اور بلکتے بچوں کی حالت دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ کام مکمل طور بند ہو چکا تھا۔ پرائے شہر میں آمدنی کا کوئی اور وسیلہ تو تھا نہیں پھر کیسے جی لیتے؟ اُدھر ٹرانسپورٹ بند تھا۔ اس لیے

لوگ یہ سوچ کر پیدل ہی چل پڑے کہ کم سے کم مر بھی جائیں تو گھر پہنچ کر ہی مریں گے۔ لیکن گھر تو سیکڑوں میل دور تھا اور آسمان سے آگ برس رہی تھی۔ پھر بھی وہ اس امید پر چلے جا رہے تھے کہ کبھی نہ کبھی منزل مل ہی جائے گی۔ دوسری جانب لوگ سرکاری اقدامات کا خیر مقدم کرنے کے لیے کبھی تالیاں، تھالیاں اور گھنٹیاں بجاتے رہے اور کبھی کورونا سپاہیوں کا حوصلہ بڑھانے کے لیے چراغاں کرتے رہے۔ مدعا صرف یہ تھا کہ اس مہاماری کے دوران ہسپتالوں کے ڈاکٹروں، نرسوں اور پیرامیڈیکل اسٹاف، پولیس والوں اور اخباری نمائندوں کی، جو جان کی بازی لگا کر اپنا فرض نبھا رہے تھے، حوصلہ افزائی ہوتی رہے۔

ڈاکٹر پارکر فکر و تردّد میں ڈوبا ہی تھا کہ سسٹر صوفیہ اس کے کمرے میں داخل ہوئی اور کہنے لگی۔ ''ڈاکٹر، آپ یہاں بیٹھے ہوئے ہیں، باہر ہسپتال کے گیٹ پر مریضوں کا سیلاب اُمنڈ آیا ہے۔ جونیئر ڈاکٹر اپنی طرف سے بھرپور کوشش کر رہے ہیں مگر سنبھال نہیں پا رہے ہیں۔ مریضوں کے رشتے دار مشتعل ہو رہے ہیں اور ہسپتال کے اسٹاف پر حملہ کر رہے ہیں۔ سر، ہسپتال میں تو اب مریضوں کے لیے بیڈ بھی دستیاب نہیں ہیں۔''

حالات کے پیش نظر کچھ روز پہلے اس ہسپتال کو خالص کووِڈ-۱۹ کے مریضوں کے لیے مختص کیا گیا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ سرکار نے سبھی سہولتیں اور جانچ کرنے کے آلات کثرت سے مہیا نہیں کیے تھے جن سے یہ پتا چلتا کہ آدمی کورونا میں مبتلا ہے یا نہیں اور اگر ہے تو مرض کی شدت کتنی ہے تا کہ یہ فیصلہ کیا جاتا کہ مریض کو کورانٹائن کرنے کے لیے واپس اس کے گھر بھیجا جائے یا پھر ہسپتال میں داخل کیا جائے۔ ڈاکٹر یہ بھی طے نہیں کر پا رہے تھے کہ تشویش ناک بیماری کی حالت میں بیمار کو کس طرح علاج کیا جائے اور اسے کونسی دوائیاں دی جائیں؟ چنانچہ بیماری نئی نئی دریافت ہوئی تھی اس لیے نہ تو اس کے لیے کوئی ٹیکہ میسر تھا اور نہ ہی کوئی مخصوص دوائی۔ جن لوگوں کی ظاہری علامات زیادہ خطرناک نہیں ہوتیں ان کو چند آزمودہ دوائیاں تجویز کی جاتیں اور پھر ضروری ہدایات دے کر واپس گھر بھیج دیا جاتا۔ انھیں گھر میں خود کو کوارنٹائن کرنے کو کہا جاتا۔

البتہ سنگین علامات والے مریضوں کے لیے ڈاکٹر ہنگامی انتظامات کرتے، ضرورت پڑنے پر انھیں وینٹی لیٹر پر ڈال دیتے تاکہ انھیں آکسیجن سپلائی جاری رہے۔ نیز ان کو ایسی دوائیاں تجویز کی جاتیں جن سے ماضی میں انفلوئنزا و دیگر وائرل بیماریوں میں مبتلا مریض صحتیاب ہو چکے تھے۔ ان کی یہ کارکردگی کچھ حد تک کامیاب رہی۔ ڈاکٹر دن رات یہی دعا کرتے کہ ان کی تشخیص و علاج کامیاب ہو۔ تاہم مسئلہ یہ تھا کہ پورے ہسپتال میں گنے چنے وینٹی لیٹر دستیاب تھے اور دھیرے دھیرے آکسیجن سپلائی بھی کم ہو رہی تھی۔ حالات اتنے نازک تھے کہ خود ڈاکٹروں، نرسوں اور دیگر پیرامیڈیکل اسٹاف کے پاس بھی ذاتی حفاظتی لوازمات مناسب مقدار میں موجود نہ تھے۔

''سر، آئی ایم سوری۔ میں آپ کی حالت سمجھ سکتی ہوں۔ آپ تو رات بھر جاگتے رہے اور مریضوں کی دیکھ بھال کرتے رہے۔ مگر یہاں اور بھی تو کوئی نہیں ہے جس کے پاس میں جا سکتی ہوں۔ جونیئر ڈاکٹر تو اپنی طرف سے سب کی تیمارداری کر رہے ہیں۔'' سسٹر صوفیہ کچھ وقفے کے بعد پھر گویا ہوئی۔

ڈاکٹر پارکر جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ تو کچھ منٹ پہلے ہی تھوڑی بہت تھکان دور کرنے کے لیے اپنے مشاورتی کمرے میں آیا تھا۔ اس نے فوراً اپنی خصوصی پی پی ای اور ماسک لگائی اور وارڈ میں چلا گیا۔ البتہ وہ اکیلا کر بھی کیا سکتا تھا۔ اس عالمی وبا کے لیے تو کوئی بھی تیار نہ تھا۔ نہ سرکار، نہ انتظامیہ اور نہ ہی عوام۔ آزادی کے بعد سرکاریں بنتی رہیں اور الیکشن میں لوگوں کو دو پہری طعام، سائیکل رکشا، ٹیلی ویژن، لیپ ٹاپ، موبائل، وائی فائی، مفت بجلی پانی، خواتین کے لیے سرکاری بسوں میں مفت سفر اور نہ جانے کن کن چیزوں کی طمع دے کر لبھاتی رہیں مگر کسی نے نہ تو صحت عامہ اور نہ ہی تعلیم کی طرف دھیان دیا کیونکہ بھوکے ننگے اور جاہل لوگوں کو ان چیزوں سے کوئی غرض نہ تھی۔

دفعتاً ڈاکٹر پارکر کی نظر ایک بیڈ پر پڑی جہاں ایک جانی پہچانی صورت نظر آ رہی تھی۔ چنانچہ سب کے منہ پر ماسک چڑھا ہوا تھا اور ڈاکٹر مریض کے زیادہ قریب نہیں جاتا تھا، اس لیے

دونوں کے بیچ کوئی بات چیت نہیں ہوئی ۔ تاہم اس نے ہیرالال جوہری کو پہچان لیا۔ اس کی تصدیق ان کاغذات سے بھی ہوئی جن پر مریض کی کیس ہسٹری لکھی گئی تھی۔ دونوں ایک ساتھ اسکول میں پڑھتے تھے، ہیرالال نے ہائرسیکنڈری کے بعد پڑھائی چھوڑ دی تھی اور اپنے آبائی پیشے کے ساتھ جڑ گیا تھا۔ ڈاکٹر پارکر نے مریض کو کوارنٹائن کرنے اور اسے کچھ دوائیاں دینے کی ہدایت دی اور وہاں سے چلا گیا۔

ہیرالال جوہری نے بھی ڈاکٹر پارکر کو پہچان لیا تھا۔ اتنا وقت گزر جانے کے باوجود پارکر کے چہرے میں زیادہ تبدیلی نہیں آئی تھی ۔ ہیرالال نے کہیں سنا تھا کہ اس کا ہم جماعت پارکر اب بہت بڑا ڈاکٹر بن چکا ہے مگر اس سے ملنے کا کبھی موقع نہیں ملا تھا۔ اس کے دل میں خیال آیا کہ اٹھ کر ڈاکٹر کو گلے لگا لے اور کہے۔ ''ارے پارکر تم تو بہت بڑے ڈاکٹر بن گئے ہو، مجھ سے کبھی ملنے بھی نہیں آئے۔'' مگر بیماری مانع بن گئی۔ کسی سے ملنے جلنے یا اس کے قریب جانے پر بالکل پابندی تھی۔ بیماری متعدی بھی تھی اور وبائی بھی، اس لیے ہر کوئی دور دور سے ہی علیک سلیک کر کے کام چلاتا تھا۔ جب سے ہیرالال میں کورونا کی علامات ظاہر ہوئی تھیں، اس کے بال بچوں نے اس کے نزدیک آنا چھوڑ دیا تھا اور آخرکار ایمبولنس بلوا کر ہسپتال پہنچا دیا تھا۔ یہاں بھی وہ باہر سے ہی الوداع کہہ کے واپس چلے گئے تھے۔ ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق وہ خود بھی گھر میں احتیاطی کوارنٹائن میں رہنے لگے تھے۔

ہیرالال جوہری اپنے ماضی کو کھنگالنے لگا۔ کیا کچھ نہیں کیا تھا اس نے اپنے بچوں کی خاطر۔ خود ٹوٹے پھوٹے مکان میں زندگی کا بیشتر حصہ گزار کر اس نے شہر کے پوش علاقے میں دونوں بیٹوں کے لیے کروڑوں کے بنگلے بنوائے تھے۔ تجارت سے آگے بڑھ کر وہ ہوٹل بزنس میں گھس گیا تھا اور کئی سو کروڑ کا مالک بن بیٹھا تھا۔ بیٹیاں بھی اپنی اپنی جگہ آباد تھیں۔ وہ بھی ڈھیر سارا جہیز لے کر سسرال چلی گئی تھیں۔ بیوی تو خیر بہت برس پہلے ہی بھگوان کو پیاری ہو گئی تھی۔ جب سے ہیرالال کو شبہ ہوا کہ وہ کورونا بیماری میں مبتلا ہوا ہے وہ ہمت ہار بیٹھا۔ اس کا وجود اپنے کمرے تک

ہی سمٹ کر رہ گیا۔ بال بچوں نے اس کے قریب آنا چھوڑ دیا۔ کھانا وغیرہ تو دروازے کے باہر رکھ کر جاتے تھے۔ ہیرالال کی تو نیند ہی اڑ گئی۔ وہ ہر لمحے موت کی آہٹ سن رہا تھا۔ اسے اب اکیلے میں ڈر لگنے لگا تھا مگر مجبور تھا، کسی کو کچھ کہہ بھی نہیں پاتا تھا۔ ہر پل موت کا پیغام لے کر چلا آ رہا تھا۔ اسے پہلی بار محسوس ہوا کہ موت کا احساس جان لیوا ہوتا ہے۔ وہ مرنا نہیں چاہتا تھا۔ ہسپتال میں داخل ہونے کے بعد اس کی حالت آہستہ آہستہ سنبھل گئی۔ دور سے ہی سہی، مگر رفتہ رفتہ ڈاکٹر پارکر سے تھوڑی بہت بات چیت ہوتی رہی اور ڈاکٹر اس کی ہمت بندھاتا رہا۔ تقریباً بارہ روز کے بعد اسے مکمل افاقہ ہوا اور ڈاکٹر پارکر نے اسے گھر واپس بھیجنے کا فیصلہ کر لیا۔

گھر.....! واپس .....! ہیرالال جوہری کے لیے اب اور ہی مسئلہ پیدا ہو گیا۔ اس کو ڈاکٹروں نے صحتمند قرار دیا مگر اب وہ کہاں جاتا؟ کیا اسی گھر میں چلا جاتا جہاں اس کے ساتھ اچھوتوں جیسا برتاؤ ہونے لگا تھا؟ اس کے کمرے کے باہر کھانا رکھا جاتا تھا؟ کیا انہی بچوں کے پاس چلا جاتا جنھوں نے اسے دوریاں بنا رکھی تھیں؟ وہ بہت پریشاں ہو گیا مگر ڈاکٹر پارکر نے اس کو سنبھال لیا۔ اس نے ہیرالال کو پیار سے سمجھایا۔ ''جو کچھ بھی آپ کے بچوں نے کیا وہ وقت کا تقاضا تھا۔ اس عالمی وبا سے ہزاروں جانیں تلف ہو چکی ہیں۔ کسی کے نزدیک جاؤ، اس سے بات کرو، اس کے ساتھ ہاتھ ملاؤ یا پھر بیماری سے متاثرہ کسی چیز کو ہاتھ لگاؤ، خطرے سے خالی نہیں۔ یہ وبا آپ کو آکٹوپس کی طرح پکڑ لیتی ہے اور پھر چھوڑنے کا نام بھی نہیں لیتی۔ اس پر مصیبت یہ کہ اس کا کوئی علاج بھی نہیں ہے۔ اس لیے بچوں نے آپ کے ساتھ جو سلوک کیا وہ واجبی تھا، آپ اس کو وقار کا مسئلہ نہ بنائیں۔ اس عمر میں گھر جانے کے سوا آپ کے پاس اور کوئی چارہ بھی تو نہیں ہے۔ بہتر یہی ہوگا کہ آپ ماضی کی تلخیوں کو بھلا کر اپنے گھر چلے جائیں۔''

ہیرالال کو ڈاکٹر کا مشورہ پسند آیا اور وہ ڈسچارج سرٹیفکیٹ لے کر اپنے گھر چلا گیا۔

گھر آئے ہوئے اسے پندرہ دن ہو گئے۔ آج نہ جانے کیوں اسے اکیلے پن اور خالی پن کا شدید احساس ہو رہا تھا۔ اسے اچانک خیال آیا کہ اپنے دوست ڈاکٹر پارکر سے موبائل پر بات

کر لے اور ساتھ ہی اس کا شکریہ بھی ادا کر لے۔

اس نے ڈاکٹر کا نمبر کئی بار ملایا مگر وہاں سے کوئی ریسپانس نہیں ملا۔ پھر اس نے سِسٹر صوفیہ کا نمبر ملایا۔ سِسٹر نے دوسری طرف سے ہیلو کہا۔

''ہیلو سِسٹر، میں آپ کا مریض ہیرالال جوہری بول رہا ہوں۔ میں نے کئی بار ڈاکٹر پارکر کا موبائل ملانے کی کوشش کی مگر وہاں سے کوئی ریسپانس نہیں مل رہا ہے۔ سوچا آپ سے پوچھ لوں۔''

''ہیرالال جی، آپ کو نہیں معلوم کہ ڈاکٹر پارکر اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ انھیں کچھ روز پہلے کورونا وائرس کا انفیکشن ہو گیا اور چونکہ وہ ذیابیطس اور عارضۂ قلب میں پہلے ہی سے مبتلا تھے اس لیے زندگی کی جنگ فوری طور ہار گئے۔'' جواب دیتے ہوئے سسٹر کا گلا رندھ گیا۔

ایک طرف سسٹر صوفیہ کی آنکھوں میں آنسو رواں تھے اور دوسری طرف ہیرالال کے سر پر جیسے پہاڑ گر پڑا۔ وہ کچھ بھی بول نہیں پا رہا تھا۔

دراصل جب سے ہسپتال کووِڈ مریضوں کے لیے مختص کیا گیا تھا ڈاکٹر پارکر اور ہسپتال کے متعلقہ ملازمین گھر نہیں جاتے تھے بلکہ نزدیک ہی ایک ہوٹل میں ان کے رہنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ انتظامیہ کو اندیشہ تھا کہ کہیں ان لوگوں کو کورونا وائرس سرایت نہ کر جائے تو ان کے کنبوں پر بھی اثر پڑے گا۔ یہ عملہ تو محاذ پر ڈٹے ہوئے سپاہیوں کی طرح ہر دم چوکنا رہتا اور کورونا مہاماری سے رات دن لڑتا رہتا۔ بدقسمتی سے ڈاکٹر پارکر کو کئی دنوں سے اس بیماری نے شدید طور پر مغلوب کیا تھا اور باوجودیکہ کئی ڈاکٹروں نے اس کو بچانے کی کوشش کی، ہر طرح کی دوائیاں اس پر آزمائیں مگر اس کو بچنا تھا نہ وہ بچ پایا۔ ایک ایسا ڈاکٹر جس نے سو سے زیادہ مریضوں کی صحت بحال کر کے انھیں گھر واپس بھیج دیا تھا، خود اس بیماری سے جوجھنے میں ناکام رہا۔

ڈاکٹر پارکر کا جنازہ جب ہسپتال سے قبرستان کی طرف لے جایا گیا تو ہسپتال کا سارا سٹاف اسے الوداع کہنے کے لیے باہر نکل آیا۔ ہر ایک کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

مریضوں نے جب یہ خبر سنی انھیں ایسا محسوس ہوا جیسے خدا نے ان سے ان کا مسیحا چھین لیا۔☆☆

خودسر صحافی

سرکار کی جانب سے جب جرنلسٹ کالونی میں پلاٹ تقسیم ہو رہے تھے تو اس کا نام فہرست میں شامل نہیں تھا۔ یہ تو ظاہر تھا کہ جو لوگ فہرست میں شامل تھے وہ ریاستی سرکار کے حمایتی تھے اور انھوں نے ماضی میں بلا واسطہ یا بالواسطہ حکومت کی طرف داری کی تھی۔ کئی بار تو انھوں نے کابینہ کے وزیروں کی بدعنوانیوں کی پردہ پوشی کی تھی۔ عطیۂ سلطانی پانے والے کئی اعلیٰ صحافی تھے جن کے اپنے روزنامے یا ہفت روزہ اخبار شائع ہوتے تھے جبکہ دوسری جانب کچھ ادنیٰ رپورٹر بھی تھے جو کسی دیسی یا بدیسی روزنامے یا میگزین کے لیے کام کرتے تھے۔ اس دور میں حکومت اشتہار بانٹ کر صحافیوں کو خوش کرتی تھی۔ حالانکہ ان کی شرح بہت زیادہ نہیں ہوتی تھی تاہم اخبار چلانے کے لیے کافی ہوتی تھی۔ اس زمانے میں موجودہ دور کی طرح کارپوریٹ کلچر نہیں تھا کہ کروڑوں کے اشتہار بانٹ کر میڈیا کی اطاعت یقینی بنائی جاتی۔ صحافیوں کا منہ بند کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ تھا، اپنی وفاداری کا ثبوت دو، اخبار کے لیے اشتہارات لو اور زندگی میں کم سے کم ایک بار بڑا سا زمین کا پلاٹ حاصل کرلو۔ اس پر مکان بنانے کے لیے سرکار رعایتی دروں پر قرضہ بھی مہیا کرتی تھی۔ دراصل صحافیوں کے لیے زمین کا پلاٹ لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ کی طرح ہوتا تھا۔ عطیۂ سرکار پانے والوں کو لاکھوں کا فائدہ ہو جاتا، اس لیے وہ خواہ مخواہ کسی وزیر یا سرکاری افسر سے نہیں الجھتے تھے۔ ورنہ یہ آ بیل مجھے مار والی بات ہو جاتی۔

صحافت کو اثر دار اور ثمر دار بنانے کا یہی واحد طریقہ نہیں تھا۔ صحافیوں، خاص کر ہفتہ وار

اخباروں کے مدیروں، نے کئی اور ہتھ کنڈے اپنا لیے تھے۔ مثال کے طور پر وہ سرکار سے کم داموں پر نیوز پرنٹ خریدتے اور اس کو کالے بازار میں فروخت کرتے۔ ان کے اخباروں کی سرکولیشن اعلان شدہ تعداد سے بہت کم ہوتی تھی پھر بھی وہ طے کیا گیا نیوز پرنٹ اور اشتہاروں کا کوٹا حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتے۔ دوسری جانب اگر کسی سرکاری افسر یا معزز شہری کی کسی کمزوری جیسے رشوت خوری، خیانت یا جنسی کجروی کا پتہ چل جاتا تو اخبار میں شائع کرنے سے پہلے اس کو دھمکی دی جاتی تاکہ اس سے بھاری رقم وصول کی جاسکے ورنہ اسٹوری کو چھاپنے میں کوئی پس و پیش نہیں ہوتی۔ چند صحافیوں نے اپنا کیریر علیٰحدگی پسند جماعتوں کی ترجمانی سے کیا، شہرت پائی اور پھر چولا بدل کر برسر اقتدار پارٹی میں شامل ہوئے یہاں تک کہ بعد میں سرکار کے اعلیٰ عہدوں پر بھی براجمان ہوگئے۔ کچھ صحافی تو باقاعدہ کسی سیاسی پارٹی سے، جس کو مستقبل میں الیکشن جیتنے کی امید ہوتی، جڑ جاتے اور اپنے سیاسی تقاضوں کی تکمیل کی کوشش کرتے۔ ایسا کرتے وقت وہ اپنے اصولوں، دعووں اور تحریروں کو یکسر بھول جاتے، زندگی بھر جو کچھ بھی لکھا ہوتا اس کو حرف غلط سمجھ کر مٹا دیتے اور پھر کروٹ لے کر نئی راگ الاپنے میں مصروف ہوجاتے۔ قلم بیچنے کے یا پھر اس کو گروی رکھنے کے یہ طریقے بہت ہی عام تھے۔

فاروق احمد ریوڑ سے الگ تھا۔ وہ ایک غریب گھر میں پیدا ہوا تھا، والد حجام تھا جو اپنے پیشے کے علاوہ ٹوٹی ہڈیاں جوڑنے کا کام بھی کرتا تھا۔ اس کام کے لیے وہ کسی سے کچھ بھی طلب نہ کرتا تاہم مریض اپنی خوشی سے کچھ دیتا تو انکار نہ کرتا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ یہ ہنر اس کو خدا نے لوگوں کی خدمت کرنے کے لیے عطا کیا ہے اس لیے اس کو آمدنی کا ذریعہ بنانا جائز نہیں ہے۔ صبح سات بجے سے شام پانچ بجے تک وہ اپنی دُکان پر لوگوں کی حجامت کرتا۔ اس کے بعد گھر لوٹ آتا اور چھ بجے کے بعد وہاں مریضوں کی تیمارداری کرتا۔ وہ اب تک سیکڑوں مریضوں کی ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کو جوڑنے میں کامیاب ہوا تھا۔ عام رائے یہی تھی کہ اس کے ہاتھ میں شفا ہے۔ وہ نہ صرف ہڈیوں کو جوڑنے کے لیے ان پر خود ساختہ دیسی پلستر چڑھا لیتا بلکہ اسے کئی ایسی جڑی بوٹیوں کا علم بھی تھا جن

کے استعمال سے ہڈیوں کو جوڑنے میں مدد مل جاتی تھی۔ وہ مریض کے لواحقین کو نسخے پر چند جڑی بوٹیوں کے نام لکھ کر دیتا اور انھیں اس کے استعمال کرنے کا طریقہ بھی سکھا دیتا۔ صوم وصلواۃ کا پابند اس نے زندگی میں ہمیشہ ایمانداری کا رِزق کمایا تھا اور اسی ماحول میں اس کا بیٹا فاروق احمد بھی پلا بڑھا تھا۔ وہ اپنے والد کو اپنا رول ماڈل مانتا تھا اور اسی کے نقش قدم پر چلنا چاہتا تھا۔

فاروق احمد نے اسکول کی تعلیم حاصل کر کے کالج میں داخلہ لیا۔ گھر کے حالات نے اسے آرٹس مضامین چننے کے لیے مجبور کر دیا اور پھر گریجویشن کی ڈگری لے کر اسے تعلیم ترک کرنی پڑی۔ لکھنے کا شوق تو اسکول ہی میں پیدا ہوا تھا مگر کالج میں وہ باقاعدگی سے افسانے لکھنے لگا جو مقامی اخباروں میں چھپتے رہے اور قارئین سے داد تحسین پاتے رہے۔ یہی وہ موڑ تھا جب وہ فاروق احمد سے فاروق شاہین بن گیا۔ ایک روز وہ اپنا افسانہ لے کر شہر کے مشہور اخبار کے دفتر پہنچ گیا اور وہاں چیف ایڈیٹر سے ملا۔ باتوں باتوں میں چیف ایڈیٹر نے اسے اپنے اخبار میں کالم نگاری کرنے اور ادبی صفحے کی ترتیب دینے کی پیش کش کی جس کے لیے اس نے فوراً ہاں کر دی۔ سوچا کچھ آمدنی ہوگی جس سے گھر کی مالی حالت کچھ حد تک سدھر جائے گی۔ اس کے کالم بہت ہی تیکھے اور حقیقت پر مبنی ہوتے تھے۔ وہ کسی لاگ ولپیٹ کے بغیر معاشرے اور انتظامیہ میں ہو رہی دھاندلیوں کا پردہ فاش کر دیتا۔ مگر وقت گزرنے کے ساتھ پانی سر کے اوپر سے بہنے لگا۔ چیف ایڈیٹر کی ٹیلیفون کی گھنٹی لگاتار بجنے لگی، کبھی کسی منسٹر کا فون آتا اور کبھی کسی اعلیٰ افسر کا، کبھی کسی صنعت کار کا اور کبھی کسی ٹھیکیدار کا۔ کوئی بڑے پیار سے سمجھا دیتا اور کوئی دھمکی بھرے لہجے میں تنبیہ کرتا۔ دھیرے دھیرے سرکاری ونیم سرکاری اشتہارات ملنے میں بھی کمی آنے لگی۔

مجبور ہو کر چیف ایڈیٹر نے فاروق شاہین کو اپنے چیمبر میں بلایا۔ ''برخوردار، آج کل یہ کیا لکھ رہے ہو تم؟ ہر طرف سے شکایتیں آ رہی ہیں۔''

''جناب، میں نے آج تک جو کچھ بھی لکھا ہے پوری تحقیق کرنے کے بعد ہی لکھا ہے۔ میں اپنے لکھے ہوئے ہر لفظ کے لیے ذمے دار ہوں۔ اس میں سے کوئی شخص ایک لفظ بھی غلط ثابت

کردے تو میں صحافت کا کام ہی چھوڑ دوں گا۔"

"فاروق، مجھے اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ تم محنت اور مشقت کر کے ہی کچھ لکھتے ہو۔ مگر ہمارے پیشے میں مصلحت پسندی سے کام لینا پڑتا ہے۔ ہمارا وجود ان لوگوں کی مالی اعانت کا محتاج ہے جن سے تم بھڑ رہے ہو۔ برخوردار سمندر میں رہ کر مگرمچھ سے بیر کرنا کہاں کی دانشمندی ہے۔ میری صلاح مانو تم اس تفتیشی صحافت سے دور رہو، یہی تمھارے مستقبل کے لیے اچھا رہے گا۔ باقی تمھاری مرضی۔"

فاروق شاہین چیف ایڈیٹر کے چیمبر سے نکل کر بوجھل قدموں سے اپنے کمرے میں چلا گیا اور گہری سوچ میں پڑ گیا۔ اسے یوں لگا جیسے کسی نے اس کے پر کاٹ دیے ہوں اور اس کی اڑان پر قدغن لگا دی ہو۔ رات بھر اسی تذبذب میں غلطاں و پیچاں رہنے کے بعد جب وہ علی الصباح گھر پہنچا تو اس نے فیصلہ کیا کہ اب وہ اخبار کے دفتر نہیں جائے گا۔ ایک طرف والد کی صحت روز بروز خراب ہوتی جارہی تھی اور دوسری طرف نوکری چلی گئی، اس لیے اس کا ذہن پریشاں رہنے لگا۔ اس درمیان ملازمت کے کئی آفرس ملے۔ ایک آفر تو بہت ہی دلچسپ تھا۔ انتہا پسند تنظیم کا ایک اخبار 'جدید حُریت' شائع ہو رہا تھا جس کو مدیر کی ضرورت تھی۔ تنخواہ دلکش تھی اور مزید کچھ اضافی مراعات بھی حاصل تھیں۔ فاروق نے اس پیش کش پر بہت غور وخوض کیا، آخرش ٹھکرا دیا کیونکہ یہ اس کی سوچ وفکر کے خلاف تھا۔ وہ انسانیت کا علمبردار تھا، اس کا نظریہ جمہوریت پسند اور سیکولر تھا اور وہ مذہبی رواداری میں یقین رکھتا تھا۔ اس کی دلی تمنا تھی کہ انسان کے ہاتھوں انسان کا استحصال بند ہو، ایک مساواتی معاشرہ وجود میں آئے اور دنیا میں امن وامان قائم ہو۔ بس اسی خواب کے لیے وہ جی رہا تھا۔

فاروق شاہین نے اپنا ہفت روزہ اخبار 'مرآت' شائع کرنے کا فیصلہ کیا۔ فارم بھرے، ٹائٹل کا رجسٹریشن کروایا اور سال بھر میں اس کو اخبار شائع کرنے کی منظوری مل گئی۔ اس کے علاوہ وہ دو غیر ملکی اخباروں کے لیے بھی بطور نمائندہ کام کرنے لگا۔ آمدنی کا بیشتر حصہ اخبار چھپوانے میں

خرچ ہوتا تھا۔ اکیلے ہی سب کچھ کرنا پڑتا تھا۔ مواد اکٹھا کرنا، اس کو چھانٹنا، کالم نگاری، تزئین و ترتیب، یہ سب کام وہ خود ہی کر لیتا تھا۔ صرف کتابت اور پرنٹنگ کا کام باہر سے کرواتا۔ سرکاری اشتہارات تو مل نہیں رہے تھے کیونکہ وہ برسر اقتدار پارٹی کا حمایتی نہیں تھا، اس لیے کبھی ان کے لیے تگ و دو بھی نہیں کی۔ البتہ اخبار کے ہر شمارے میں کسی نہ کسی معزز رائٹر کا مضمون شامل رہتا تھا۔ مضامین کے موضوعات سیاست سے لے کر اقتصادیات تک اور سماجیات سے لے کر ماحولیات تک پھیلے ہوئے تھے۔ وہ خود بھی معاصر مسائل پر قلم اٹھاتا اور قارئین کو سوچنے پر مجبور کر دیتا۔ اداریے بہت ہی معنی خیز ہوتے جن میں نہ کہیں موقع پرستی نظر آتی اور نہ ہی زمانہ سازی، نہ شدت پسندوں کی طرف داری ہوتی اور نہ ہی ملکی انتظامیہ کی چاپلوسی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اخبار نے اپنا ایک معیار قائم کیا اور تعلیم یافتہ حلقوں میں کافی مقبول ہوا۔

پھر ایک روز اس نے ان لوگوں کے بارے میں لکھنا شروع کیا جو کمسن بچوں کو اپنی ڈھال بنا کر سیکورٹی فورسز کے ساتھ معرکہ آرائی کرتے۔ وادی میں روزانہ کسی نہ کسی جگہ دہشت گردی کی واردات پیش آتی تھیں اور جونہی سیکورٹی فورسز کو مخبروں کی وساطت سے معلوم ہوتا کہ ملی ٹنٹ کسی مکان میں قیام پذیر ہیں یا پھر کسی گاؤں میں داخل ہو کر کوئی سنگین واردات انجام دینے کی فراق میں بیٹھے ہیں تو وقت گنوانے کے بغیر وہ اس علاقے کی گھیرابندی کر لیتے۔ فوج کے آتے ہی سارے علاقے میں ہلچل مچ جاتی۔ وہ ٹولیوں میں بٹ کر الگ الگ جگہوں پر تعینات ہو جاتے اور اپنے ارد گرد کسی نقل و حرکت پر کڑی نظر رکھتے۔ کہیں کچھ شک و شبہ ہو جاتا تو فوراً گولیاں چلا کر کارروائی کر لیتے۔ البتہ حیرانی کی بات یہ تھی کہ آناً فاناً نہ جانے کہاں سے بچوں کے غول فوجیوں کی طرف بڑھنے لگتے اور ان پر پتھر برسانے لگتے۔ ایسے مناظر تو فلسطین، شام اور کئی دوسری جگہوں پر عام نظر آتے تھے۔ چونکہ ٹیلی ویژن پر یہ سب کچھ دکھایا جاتا تھا اس لیے یہاں کے جنگجوؤں نے بھی اس حربے کو اپنا لیا۔ حالانکہ ایسی روایت تو یہاں پہلے ہی سے موجود تھی۔ ماضی میں یہاں احتجاجی جلسوں جلوسوں کے شرکا پولیس پر کانگڑیاں، پتھر اور جوتے چپل پھینکنے کے عادی تھے جبکہ

پولیس اپنے بچاؤ کی خاطر بھیڑ کو تتر بتر کرنے کے لیے ان پر یا تو لاٹھی چارج کرتی یا پھر آنسو گیس کے گولے پھینکتی۔ مگر اب تو زمانہ ہی بدل چکا تھا۔ اب تو سنگ باری ایک منظّم حکمت عملی تھی جو ایسی صورت حال میں ملی ٹنٹوں کو سیکورٹی فورسز سے بچانے کے لیے اختیار کی جاتی تھی تاکہ وہ موقع واردات سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو جائیں۔ اس پر طرّہ یہ کہ اب پتھر بازی نوجوان نہیں کر تے تھے بلکہ کمسن اور معصوم بچے کر رہے تھے۔ اس حوالے سے چند خفیہ رپورٹوں کے مطابق اس کام کے لیے بچوں کو باقائدہ پانچ پانچ سو روپے دیے جاتے تھے۔

فاروق شاہین بچوں کی اس حالتِ زار کو نہیں دیکھ پا رہا تھا۔ اس کو فکر لاحق ہو رہی تھی کہ اس طرح وادی میں بچوں کا مستقبل تاریک ہوتا جا رہا ہے۔ امیروں، سیاست دانوں اور شدت پسند رہنماؤں کی اولادیں تو وادی سے باہر جا کر تعلیم حاصل کر رہی تھیں، اس لیے اس طبقے پر ان باتوں کا کوئی اثر نہیں پڑ رہا تھا۔ ان کے بال بچے ملک کی باقی ریاستوں میں میڈیکل، انجینئرنگ اور بزنس منیجمنٹ کی تعلیم حاصل کر کے امریکہ، یورپ یا پھر خلیجی ممالک میں نوکری کرنے چلے جاتے تھے۔ اس کے برعکس غریبوں کے بچے مالی حالات کے سبب ریاست سے باہر نہیں جا پاتے تھے اور ریاست ہی میں تعلیم حاصل کرنے پر قناعت کرتے تھے۔ مقامی تعلیمی ادارے تو روزانہ کھلتے نہیں تھے اور اگر کھل بھی جاتے تو کبھی استاد غیر حاضر رہتے اور کبھی طلبہ۔ یہاں سب اپنی مرضی کے مالک تھے اور کوئی پوچھنے والا بھی نہیں تھا۔ تعلیم کا معیار روز بروز نیچے گرتا جا رہا تھا اور طلبہ مسابقتی امتحانات میں شرکت کرنے سے گھبراتے تھے۔ اس پر مصیبت یہ کہ وادی میں کئی دہائیوں سے نئے صنعتی ادارے نہیں کھل رہے تھے اور جتنے پہلے ہی سے موجود تھے وہ بھی ایک ایک کر کے بند ہو رہے تھے۔ انجام کار نوجوانوں کے لیے روزگار کے مواقع نہ ہونے کے برابر تھے۔ جو غریب طلبہ ڈگریاں لے بھی لیتے انھیں نوکری کے لیے در در کی ٹھوکریں کھانا پڑتی تھیں۔ ایسی صورت حال کا فائدہ اٹھا کر عسکری تنظیمیں ان کو اپنے ساتھ شامل کرنے کی درپے رہتی تھیں اور کافی حد تک کامیاب بھی ہوتی تھیں۔

اتنا ہی نہیں، تعلیمی ادارے مختلف حالات کے سبب اکثر بند رہتے تھے۔اس لیے غریب کمسن بچوں کے پاس فرصت ہی فرصت تھی۔ایک سوچی سمجھی چال کے تحت انھیں پتھر پھینکنا سکھایا جاتا اور کئی قسم کی ترغیبات دی جاتی تھیں۔خام ناپختہ ذہنوں پر انقلابی اور مذہبی باتوں کا بہت جلد اثر پڑتا ہے۔نتیجے میں ہزاروں اطفال انتہا پسندوں کے دام میں پھنس جاتے اور موقع بہ موقع نعرہ بازی کے ساتھ ساتھ سیکورٹی فورسز پر پتھراؤ کرنے کے لیے سڑکوں پر نکل آتے۔دوسری جانب ہر روز کے ان مناظر کو دیکھ کر فاروق شاہین تلملاتا اور اس کا ضمیر اس کو ملامت کرتا۔اس کے دروں میں خود بخود مکالمہ جنم لیتا۔

''تم کچھ کرتے کیوں نہیں؟ کیا قوم کو صحیح راستے پر لانا تمھارا فرض نہیں ہے؟'' غیب سے کوئی آواز آتی۔

''نہیں نہیں، ہرگز نہیں! قوم کی قوم جانے۔تم اس جھمیلے میں نہیں پڑنا۔اپنے ارد گرد دیکھو، لوگوں نے بڑی بڑی عالیشان عمارتیں کھڑی کر دی ہیں۔اور تم لنڈورے کے لنڈورے ہی رہے!'' پہلی آواز کے مقابلے میں ایک اور آواز سنائی دیتی۔

''بنائی ہوں گی پر اپنے ساتھ کوئی تھوڑا ہی لے کر گیا۔فاتح عالم سکندر بھی اس دنیا سے خالی ہاتھ ہی چلا گیا۔''

''اُس سے کیا ہوتا ہے، جب تک جیا، ٹھاٹ سے جیا، مرنے کے بعد کون دیکھتا ہے۔ انسان کو بس ایک ہی زندگی مل جاتی ہے اس کا بھرپور فائدہ اٹھانا چاہیے۔''

''عیش وعشرت تو چند ساعتوں کا انبساط ہے، وقتی سرور ہے جو ہمیشہ نہیں رہتا۔اگر رہتا ہے تو بس انسان کا نام اور اس کا کردار۔جو آدمی اپنی زندگی انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے وقف کرتا ہے وہ تاریخ کا حصہ بن جاتا ہے۔''

فاروق شاہین اس دُبدھا کا حل ڈھونڈنے کی کوشش کرتا مگر سامنے شیطان کی آنت کی مانند تاریک سُرنگ کے سوا کچھ بھی دکھائی نہیں دیتی۔وہ رات بھر کروٹیں بدلتا رہتا، نیند تھی کہ

آنکھوں سے کوسوں دور بھاگ جاتی اور رات آنکھوں آنکھوں میں کاٹنا پڑتی ۔ سیاسی اور مذہبی جھمیلوں سے وہ دور ہی رہتا مگر معاشرے کے تنزل کو برداشت نہیں کر پاتا تھا۔ انتہا پسندوں سے اسے کوئی ذاتی بیر نہیں تھا، وہ سب بالغ تھے اور بھلے بُرے کی تمیز کر سکتے تھے ۔ البتہ اس کو اٹھتے بیٹھتے یہ غم کھائے جارہا تھا کہ ان معصوم بچوں کو آتش بے سود میں کیوں جھونکا جارہا ہے۔ بچے تو کمسن ہیں، ان کے اذہان کچے ہیں اور وہ اس بات کی تمیز نہیں کر سکتے کہ ان کے لیے اچھا کیا ہے اور برا کیا۔ آخر کار فاروق شاہین نے تہیہ کرلیا کہ وہ اس مسئلے پر اپنے اخبار میں لکھ کر مہم چلائے گا اور لوگوں کو بیدار کرے گا کہ ہماری نئی نسل برباد ہورہی ہے۔ اگلے شمارے سے اس نے اپنے اخبار میں اس مسئلے پر سلسلہ وار اداریے لکھنا شروع کر دیا اور والدین سے اپنی اولادوں کو بچانے کی تلقین کرنے لگا۔ اس مسئلے پر اس نے باضابطہ مکالمہ کھڑا کر دیا جس میں روشن خیال قلم کاروں نے زور وشور سے حصہ لیا۔

وادی میں پہلے تو دبی زبان میں چہ مہ گوئیاں شروع ہوگئیں، پھر لوگوں نے جذباتی طور پر فاروق شاہین کی طرفداری کی اور آپس میں صلاح ومشورہ کرنے لگے۔ ایسی صورت حال عسکری جماعتوں اور انتہا پسندوں کے لیے نا قابل برداشت تھی ۔ یہ تو ان کے وجود اور نظریے کو کھلا چیلنج تھا۔ اس لیے سبھی تنظیمیں حرکت میں آگئیں ۔ برسر اقتدار لوگ بھی، چنانچہ غیر مساعد حالات کا فائدہ اٹھا کر کرسیوں پر براجمان تھے، دامے، درمے، قدمے، سخنے ان کو خفیہ طور پر مدد کرنے لگے۔ شاہین کو کئی خیر خواہوں نے مشورہ دیا کہ وہ اس طرح اپنی جان گنوا بیٹھے گا مگر اس پر تو جنون سوار تھا، وہ آگے آنی والی نسلوں کو اس تخریبی کارروائی سے بچانا چاہتا تھا۔ اس لیے وہ اپنی ہی دھن میں چلتا رہا اور ان لوگوں کی مذمت کرتا رہا جو بچوں کا مستقبل خراب کر رہے تھے۔

کچھ عرصے کے بعد فاروق شاہین کو باضابطہ تہدید آمیز خط آنے لگے۔ کئی بار اس کا فون بج اٹھا اور اسے جان سے مارنے کی دھمکی دی گئی لیکن وہ تو سر پر کفن باندھے اپنی مہم پر نکل پڑا تھا اس لیے اس نے کسی کی نہ سنی۔ پولیس نے بھی کئی بار اس کو سیکورٹی دینے کا آفر کیا مگر اس نے یہ کہہ کر

ٹھکرایا کہ موت تو کسی دن آنی ہی ہے، آپ کا حفاظتی دستہ اس کو کیسے ٹال سکتا ہے۔ مجھے اپنی قوم پر پورا بھروسہ ہے۔ مجھے ایسا کوئی خطرہ محسوس نہیں ہو رہا ہے۔

پھر ایک روز وہی ہوا جس کا سب کو اندیشہ تھا۔ فاروق شاہین اپنے چھوٹے سے دفتر کو قفل لگا کر گھر کی طرف روانہ ہوا۔ رات کے نو بج چکے تھے۔ کافی اندھیرا ہو چکا تھا۔ دفتر سے اترتے ہی وہ سڑک پر آٹو کا انتظار کرنے لگا۔ سامنے سے منہ پر ڈھاٹا باندھے دو آدمی موٹر سائیکل پر نمودار ہو گئے۔ سوار نے پاس پہنچ کر موٹر سائیکل کی رفتار کم کر دی اور اس کے پیچھے بیٹھے دوسرے آدمی نے اپنی پستول تان کر فاروق شاہین کو نشانہ بنا دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے پستول سے کئی گولیاں نکل پڑیں اور پھر دونوں موٹر سائیکل کی رفتار تیز کر کے فرار ہو گئے۔ فاروق شاہین کا لہولہان جسم وہیں سڑک پر لڑکھڑا کر گر گیا، بہت دیر تک تڑپتا رہا اور آخر کار بے حس وحرکت ہو گیا۔ کچھ وقفے کے بعد پولیس آئی اور لاش کو اٹھا کر پوسٹ مارٹم کے لیے لے گئی۔

ساری وادی خاص کر انٹلکچول طبقہ ماتم میں ڈوب گیا۔ مگر کسی کو کھلے طور پر اپنے خیالات ظاہر کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ نماز جنازہ کے وقت بھی چند قریبی رشتے دار ہی حاضر ہوئے۔ ایک عقلیت پسند صحافی کی آواز ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئی۔

پتوں پر لکھی تحریریں

ایک چھوٹی سی دنیا تھی وہ۔ٹرین نہ ٹرام، ٹیلی ویژن نہ موبائیل۔کچھ گھروں میں ریڈیو تھا جس پر بزرگ خبریں اور موسم کی پیش گوئی سننے کے لیے بے قرار رہتے۔نوجوان ہر بدھوار کو بِنا کا گیت مالا کا بے صبری سے انتظار کرتے اور بچے ہر اتوار کو بچوں کے پروگرام میں بھائی جان کی آواز سننے کے متقاضی ہوتے۔اس کے علاوہ عشق کے مارے لڑکے لڑکیاں تھیں، جب دیکھو تب ریڈیو پر پرانی فلموں کے گانے سنا کرتے اور ریڈیو کی آواز اتنی بلند رکھتے کہ سامنے کھڑکی پر بیٹھی معشوقہ کے کانوں سے اس کے بول جاٹکراتے اور وہ برہ کی آگ میں جلتی رہتی۔پھر بھی کیا مجال کہ کوئی ایک دوسرے سے براہ راست بات کرنے کی ہمت جٹا لیتا۔دونوں کو اس بات کا احساس ہوتا کہ سامنے والے کے دل میں کچھ کچھ ضرور ہو رہا ہے مگر ایک عجیب قسم کی جھجھک تھی، گھبراہٹ تھی، سنکوچ تھا جو ان کو ایک دوسرے سے دور رکھتا۔دراصل ایک دوسرے کا لحاظ ہوتا تھا، اس کی عزت و ناموس کا خیال رہتا تھا۔

''نہ جانے کیا سوچے گی اگر میں نے پیش قدمی کی؟''

''نہ جانے میرے بارے میں کیا رائے قائم کرے گا اگر میں نے پہل کی یا مسکرا کر پیار کا اظہار کیا؟''

دونوں انھی وسوسوں میں برس ہا برس گزار دیتے تب تک جہلم دریا میں بہت سارا پانی بہہ جاتا۔پھر شہنائیاں بج اٹھتیں۔لڑکی کہیں اور بیاہی جاتی اور لڑکا کہیں اور۔رُخصتی سے پہلے ریڈیو پر دوسری طرف یہ گانا بج اٹھتا۔''کہہ دو کوئی نا کرے یہاں پیار، اس میں خوشیاں ہیں کم، بے شمار

ہیں غم، اک ہنسی اور آنسو ہزار.....''

اتفاقاً اگر عشق پروان چڑھتا بھی تو گھر سے میلوں دور ایک دوسرے سے ملنے کے لیے جانا پڑتا تھا۔ کالج کے پھاٹک کے باہر لڑکا انتظار کرتا، اپنی تعلیم فراموش کر کے کئی کئی گھنٹے وہاں کھڑا رہتا اور تب جا کر وہ نظر آتی، سفید شلوار اور سفید کرتے میں ملبوس، سر پر سفید اوڑھنی اوڑھے، بالکل سنگ مرمر کی چلتی پھرتی مورت کی طرح۔ مگر اکیلی نہیں اس کے ساتھ اس کی سہیلیاں ہوتیں، اور وہ بار بار پیچھے مڑ کر دیکھتی۔ مجنون جی تھوڑے فاصلے پر پیچھے پیچھے چلتے رہتے۔ بعض اوقات لیلیٰ پیچھے مڑتی، مسکراہٹیں بکھیرتی اور پھر وہی آگے ہم اور پیچھے تم۔ گھر پہنچنے میں آدھا پون گھنٹہ تو لگ ہی جاتا تھا۔ تب تک دونوں ایک دوسرے کی صورت اپنی آنکھوں میں بسا لیتے۔ شام کو جب ہلکی سی چاندنی میں سارا ماحول نہا لیتا تو محبوب کے ریڈیو سے گانا سنائی دیتا۔ ''آجا صنم مدھر چاندنی میں ہم تم ملے تو ویرانے میں بھی آ جائے گی بہار....''

جوانی میں نرنجن ناتھ ڈرپوک بھی تھا اور شرمیلا بھی۔ اس لیے کبھی کسی لڑکی سے بات کرنے کی جرأت نہیں کی۔ اس نے پہلا عشق اپنی بیوی کے ساتھ ہی کیا تھا اور وہ بھی شادی کے بعد۔ ارینجڈ میرج تھی، والدین نے لڑکی دیکھ لی، اس کے خاندان کے بارے میں جانکاری حاصل کی اور جب پوری طرح مطمئن ہوئے تو بیٹے کی شادی کے لیے ہاں کہہ دی۔ نرنجن سے کوئی پوچھتا تو وہ صرف یہ کہتا کہ والدین جو بھی کریں گے مجھے منظور ہے آخر وہ میرا بُرا تو نہ چاہیں گے۔

ان دنوں سنتے تھے کہ شہر کی سرحد پر کہیں کوئی ہوائی اڈہ بھی ہے مگر دیکھا کسی نے نہیں۔ غریبوں کا ہوائی اڈے سے کیا کام! ہاں دن میں ایک دو بار گردوں پر ہوائی جہاز کی گڑگڑاہٹ سنائی دیتی تھی۔ بچے آنگن میں جمع ہو کر اوپر آسمان کی طرف دیکھتے اور خوشی سے تالیاں بجاتے جب تک ہوائی جہاز نظروں سے غائب نہ ہوتا۔

بہت ہی چھوٹی سی دنیا تھی۔ ضرورتیں کم تھیں اور ذرائع آمدنی محدود تھے۔ تنخواہیں قلیل تھیں، گورنمنٹ نوکری مل جاتی مانو کوئی قلعہ فتح کر لیا ہو۔ سارے خاندان میں خوشیوں کی لہر دوڑ

جاتی۔ پرائیویٹ کمپنیوں یا کارخانوں کا کہیں کوئی نام ونشان ہی نہ تھا۔ ہاں چند ایک پرائیویٹ بنک شہر میں کھلے تھے۔ جس شخص کو جوڑ توڑ کر کے بھی گورنمنٹ نوکری نہ ملتی اسے تجارت کا سہارا لینا پڑتا اور اگر سرمایہ نہ ہوتا تو کسی دکان پر ملازمت کرنی پڑتی۔ وہ بھی ممکن نہ ہوتا تو مزدوری کر کے پیٹ پالتا اور سردیوں میں پنجاب چلا جاتا۔ عام طور پر لوگ آبائی پیشہ جیسے کسانی، ملاحی، ماہی گیری یا کاریگری اپنا لیتے۔ بہر حال ہر ایک کے چہرے سے اطمینان اور قناعت ٹپکتی جیسے کسی کو کوئی غم وفکر ہی نہ ہو۔ ہر کوئی مالک دوجہاں کی اطاعت گزاری اور شکر گزاری میں اپنے شب وروز گزارتا۔ نرنجن ناتھ کو پنجاب نیشنل بنک، جس کا ابھی قومیانہ نہیں ہوا تھا، میں کلرک کی نوکری ملی اور وہ خود کو خوش نصیب سمجھنے لگا۔

ایسا نہیں تھا کہ اس وقت لوگوں کو کسی مصیبت کا سامنا نہیں کرنا پڑتا تھا یا پھر ان کے پاس کسی چیز کی کمی نہ تھی مگر وہ اسے اپنا نصیب سمجھ کر بھولنے کی کوشش کرتے۔ بیوائیں اپنے بچھڑے ہوئے شوہر کی یادوں کے سہارے ساری عمر گزارتیں۔ مردوں کو البتہ چھوٹ تھی۔ جب دیکھو نئی شادی کر لیتے۔ ادھر بیوی مری نہیں اُدھر دوسری شادی ہوتی، دوسری بھی اگر آنکھیں موندتی، تیسری تیار رہتی۔ نہ عمر کا لحاظ اور نہ جذبات کی قدر۔ کہیں کہیں ایسی صورت حال ہوتی کہ اِدھر ماں بچہ جنتی اور اُدھر بیٹی۔ کسی لڑکے کا ماما اس سے کم عمر کا ہوتا اور وہ ماما کا لفظ سننے سے گھبرا جاتا۔ پھر بھی نہ جانے کیوں اُس دنیا میں نفسا نفسی نظر نہیں آتی تھی، کوئی ریس دکھائی نہیں دیتی تھی یا پھر کسی کی زندگی میں کہیں کوئی خلا نظر نہیں آتا تھا۔

اس چھوٹی سی دنیا میں کتنا سکون تھا۔ آدمی نوّے سال کی عمر میں بھی پہاڑیاں چڑھتا، نہ ذیابیطس اور نہ ہی قلبی امراض۔ کبھی کسی کے منہ سے ایسے کلمات سنائی نہیں دیتے تھے کہ ''ہے بھگوان اب تو اٹھا لے بہت جی لیا میں نے۔'' آخر ایسے کلمات کی ضرورت ہی کیا تھی۔ آدمی خود کو کیوں کوستا! بھرا پُرا گھر ہوتا۔ دیکھ بھال کے لیے بیٹے بیٹیاں اور بہوئیں ہوتیں۔ خوشیاں بانٹنے کے لیے پوتے پوتیاں اور نواسے نواسیاں ہوتیں۔ جی بہل جاتا۔ کوئی ٹوپی اتارتا، کوئی عینک چھین لیتا، کوئی بھجنوں

کی کتاب پھاڑ دیتا اور کوئی حقے کی نے غائب کر لیتا۔ بوڑھے کو اس میں بھی عجیب سا لطف آجاتا۔ باہر سے وہ بچوں کو ڈانٹتا مگر دل سے یہی چاہتا کہ وہ بندروں کی طرح اچھل کود کریں، کندھوں پر چڑھیں اور چھینا جھپٹی کرتے رہیں۔

مجھے اس بات سے انکار نہیں کہ ان دنوں اکثر لوگ کم عمری ہی میں مر جاتے، عورتیں زچگی میں جان بحق ہو جاتیں اور بچے آنکھ کھولتے ہی بھگوان کو پیارے ہو جاتے۔ جی بھی لیتے تو آگے جا کر جوانمرگ ہو جاتے۔ دو تین دن کوئی مہلک بیماری آدبوچتی، حکیم ڈاکٹر سارے نسخے آزماتے جو کارگر نہ ہوتے اور مریض دم توڑ دیتے۔ ہاں جو خوش نصیب زندہ رہنے میں کامیاب ہوتے ان کی عمر دوا دارو کے بغیر ہی دراز ہوتی۔ اس کے برعکس آج کل جتنی بیماریوں کے نام سننے میں آتے ہیں ان سے تو دل ہی بیٹھ جاتا ہے۔ انسان کی اوسط عمر بڑھ گئی ہے مگر ساتھ ہی وہ زندگی سے اکتا گیا ہے۔ اذیت برداشت کرنے کے لیے مریضوں کی زندگی کے ایام میں توسیع کی جاتی ہے۔ اور وہ تڑپتا ترستا، سکون آور دوائیوں کے بل بوتے پر دن گزارتا رہتا ہے۔

دراصل گذشتہ صدی نے ہماری کایا ہی پلٹ دی۔ سائنس اور ٹکنالوجی نے زندگی کی رفتار تیز سے تیز تر کر دی۔ کہتے ہیں دنیا نے جتنی ترقی ابتدا سے انیسویں صدی تک کی تھی اس سے زیادہ ترقی بیسویں صدی میں کر لی ہے۔ ہر جانب فاصلے سکڑ گئے ہیں۔ ساری دنیا ایک عالمی گاؤں میں تبدیل ہو گئی ہے۔ کہاں تو نرنجن ناتھ نے جغرافیہ کا سبق پڑھتے ہوئے امریکا اور برطانیہ جیسے ممالک کا نام سنا تھا اور نقشے پر ان کا محل وقوع دیکھا تھا اور کہاں اب اس کے دونوں بچے تعلیم حاصل کر کے سمندر پار ان ملکوں میں جا بسے ہیں۔ بیٹا امرت ٹیکساس میں ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں کام کر رہا ہے اور بیٹی ارادھنا یو کے میں ڈاکٹر ہے۔ امرت جن دنوں ایم بی اے کرتا تھا کالج کی ایک لڑکی پر فریفتہ ہو گیا، امیر باپ کی اکلوتی بیٹی تھی اور پڑھائی میں بہت تیز۔ دونوں کی جوڑی خوب جمی اس لیے اپنے والدین سے بات کر کے شادی کر لی۔ نہ جنم پتری اور نہ نجومی کی رائے، نہ ذات کی فکر اور نہ منگلیک کا چکر، تاہم شادی میں ہندو ریتی رواج کے تحت سات پھیرے لگائے گئے۔ چونکہ نرنجن

ناتھ کشمیر سے ہجرت کر کے دوار کا دہلی میں رہ رہا تھا اس لیے ریسپشن اشوکا ہوٹل دہلی میں دیا گیا۔ پھر دو روز بعد ہی دونوں اپنا بوریا باندھ کر امریکا چلے گئے۔ بیٹی انورادھا کا معاملہ کچھ مختلف سا تھا۔ لیڈی ہارڈنگ میں ایم بی بی ایس مکمل کرنے کے بعد ہسپتال میں انٹرن شپ کر رہی تھی جہاں ایک سینئر ڈاکٹر کی نظر اس پر پڑی۔ دو چار ملاقاتیں ہوئیں اور پھر بات ازدواجی بندھن تک آ پہنچی۔ شادی کرنے کے بعد انھوں نے بھی ملازمت کے لیے برطانیہ کی راہ لی۔

باقی بچے نرنجن ناتھ اور اس کی بیوی نرملا۔ اتنے بڑے کنکریٹ کے شہر میں دونوں مہاجر ایک دوسرے کا منہ تکتے رہتے۔ انھیں ہر چہرہ اجنبی لگتا۔ نہ آگے کوئی اور نہ پیچھے کوئی۔ اکیلے دوکیلے کا اللہ بیلی۔ انھیں اپنا فلیٹ ایک دڑبے کی مانند لگ رہا تھا، چاروں طرف سے بند، نکلنے کا ایک ہی راستہ اور نیچے اتر کر سامنے سڑک تھی۔ نہ سبزہ، نہ پھول پتی اور نہ سایہ دار درخت۔ بات کرنے کو کوئی اپنا نہ ملتا۔ کالونی میں سب لوگ مختلف ریاستوں سے تعلق رکھتے تھے اور مختلف بھاشائیں بولتے تھے۔ میاں بیوی ایک ساتھ مارننگ واک اور اشیائے خوردنی خریدنے نزدیکی بازار میں چلے جاتے، باقی وقت فلیٹ کی چاردیواری ہی میں گزرتا۔ بچے ہفتے میں کئی بار وہاٹس اپ پر ویڈیو کال کرتے، دونوں ایک دوسرے کی صورت دیکھتے اور دیر تک باتیں کرتے۔ ان کی کوشش رہتی کہ والدین کو دلاسہ دیں اور انھیں تنہائی محسوس نہ کرنے دیں۔ مگر والدین تھے کہ بہت ساری باتیں کر کے بھی تسلی نہ ہوتی۔ کال ختم ہوتے ہی وہی اکیلا پن اور وہی بے مہری کا احساس ہونے لگتا۔

اور پھر ایک روز سرکار نے لاک ڈاؤن کا اعلان کر دیا۔ کورونا وائرس کے سبب لوگوں کی نقل و حرکت پر قدغن لگائی گئی۔ راستے پر کہیں کوئی آدمی نظر نہیں آتا تھا۔ چاروں طرف صرف پولیس کی گاڑیاں اور پولیس والے۔ نیشنل اور انٹرنیشنل ہوائی اڑانیں بند ہو گئیں۔ ٹرانسپورٹ اور ریل گاڑیاں بھی بند ہو گئیں۔ نرنجن ناتھ اور نرملا کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں۔ اس بڑھاپے میں کیسے گزر بسر کریں گے؟ اُدھر امرت اور ارادھنا بھی پریشان ہو رہے تھے مگر لاچار تھے۔ دن میں کئی بار ویڈیو کال پر ماں باپ سے بات کرتے اور انھیں ڈھارس دیتے۔

آج لاک ڈاؤن کا آٹھواں دن تھا۔ نرنجن ناتھ نیند سے جاگا مگر نرملا ابھی سو رہی تھی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ آج کیا بات ہوگئی۔ یوں تو نرملا علی الصباح ہی جاگ جاتی تھی اور اس کے لیے بیڈ ٹی بنا کر لاتی تھی۔ وہ گھبرا گیا۔ نرملا کو جگانے کے لیے اسے ہلایا ڈلایا۔ وہاں کوئی جوابی حرکت نظر نہیں آئی۔ اس کی نبض ٹٹولی مگر وہاں بھی خاموشی پائی۔ نیچے جا کر پولیس سے مدد مانگی۔ وہ نرملا کو پاس ہی ایک ہسپتال تک لے گئے جہاں ڈاکٹر نے اسے مردہ قرار دیا۔ نرنجن ناتھ کے سر پر جیسے آسماں گر پڑا۔

حسب معمول امرت نے ویڈیو کال لگائی۔ اس وقت نرنجن ناتھ ہسپتال میں تھا۔ امرت کی ماں جس نے اس کو نو مہینے اپنی کوکھ میں پالا تھا اور عمر بھر دنیا کے سرد و گرم سے بچا کر رکھا تھا، آج دنیا سے کوچ کر گئی تھی۔ وہ بے بس تھا۔ کچھ کر بھی نہ سکتا تھا۔ اس کے آنے کی امید تو صفر کے برابر تھی۔ بین الاقوامی ہوائی جہاز بند تھے۔ نہ وہ آسکتا تھا اور نہ ہی ارادھنا۔ دریں اثنا ارادھنا کو بھی اس نے خبر کر دی۔ روتے بسورتے امرت نے اپنے پتا جی سے گزارش کی۔

''پاپا، ممی کی صورت تو دکھا دو۔ کیا اسی دن کے لیے میں نے جنم لیا تھا کہ اس کی آخری رسومات میں بھی شرکت نہ کرسکوں؟''

''بیٹے، یہ سب کال چکر کی دین ہے۔ اس میں انسان کچھ بھی نہیں کرسکتا۔ تمہاری ماں تمھیں آسمان کی بلندیاں چھوتے ہوئے دیکھنا چاہتی تھی۔ اسے کیا معلوم تھا کہ اس کے آخری سفر پر تم اس کا کریا کرم بھی نہیں کر پاؤ گے۔'' نرنجن ناتھ کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔

نرنجن ناتھ نے اپنے موبائیل کا رُخ نرملا کی جانب کیا اور بیٹے کو اپنی ماں کے آخری درشن کرائے۔ کال جونہی ختم ہوئی تو ارادھنا کی ویڈیو کال آئی۔ وہ بھی زار و قطار رو رہی تھی۔

''پاپا، یہ کیا ہوا۔ ممی ہمیں چھوڑ کر کیوں چلی گئی؟ اسے تو کوئی ایسی بیماری بھی نہ تھی۔''

''بیٹے، رات کو معمول کی طرح سوئی، مگر صبح جاگ ہی نہ پائی۔ تمہاری ممی تو مجھے اکیلا چھوڑ کر چلی گئی۔ میں ٹوٹ گیا ہوں، بکھر گیا ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اب کس کے سہارے جیوں

میرا اہم سفر مجھ سے بچھڑ گیا ہے بیٹی۔'' نرنجن ناتھ کی گھگی بندھ گئی۔

''پاپا، صبر کیجیے، ہونی تو ہو کر ہی رہتی ہے۔ میں نے تو کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ گذشتہ سال آپ لوگ یہاں آئے تھے، کہیں کوئی شبہ بھی نہیں ہوا کہ ممی اتنی جلدی ہمیں چھوڑ کر چلی جائے گی۔ پاپا مجھے اس کے انتم درشن تو کرائیے۔''

نرنجن ناتھ نے پھر ایک بار موبائیل کا رخ موڑا اور ارادھنا کو نرملا کا چہرا دکھایا۔ پھر کال بند ہوگئی۔

نرنجن ناتھ کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس سنسان ماحول میں کیسے لاش کو مرگھٹ تک پہنچائے۔ کوئی اپنا قریب نہ تھا۔ چند ایک رشتے دار تھے مگر سبھی دور تھے اور ٹرانسپورٹ بند ہونے کی وجہ سے کوئی آ نہیں سکتا تھا۔ وبا کی وجہ سے انسان انسان سے ڈر رہا تھا، ایسی صورت میں پڑوسیوں سے امید کرنا واجب نہ تھا۔ پولیس نے نرملا کا انتم سنسکار کرنے کے لیے نزدیک ہی مرگھٹ کے انتظامیہ سے رابطہ قائم کیا۔ ان کی جنازہ گاڑی آئی اور لاش کو اٹھا کر لے گئی۔ ساتھ میں صرف نرنجن ناتھ تھا اور کوئی نہیں۔

آخر کار نرنجن ناتھ نے چِتا کو اگنی دکھائی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی پتنی کے مردہ جسم کو آگ کی لپٹوں نے چاروں طرف سے گھیر لیا۔

ایک ماں کا شریر پنچ تتو میں ولین ہونے لگا۔ اس وقت نہ اس کا بیٹا حاضر تھا اور نہ ہی اس کی بیٹی۔

سلگتے خواب

خوابوں کی تعبیر ڈھونڈ نے میں وہ ہمیشہ غلطان و پیچان رہتی تھی ۔ سمجھ نہیں آتا تھا کہ نعیمہ اشرف نے کتنے خواب پالے تھے۔

اپنی زندگی کو حسین تر بنانے کے لیے وہ دن رات خواب دیکھتی رہتی تھی۔ پھر بھی اسے لگتا تھا کہ زندگی آج بھی ویسی ہی ہے جیسے کل تھی یا کئی روز پہلے تھی یا پھر کئی سال پہلے تھی۔ کہیں کوئی فرق نظر نہیں آتا تھا۔ وہی بے قراری، وہی بے ثباتی، وہی بے صبری، وہی بے قاعدگی۔

ہوسکتا ہے کہ اس کا ذمہ دار عدم تحفظ رہا ہو۔ صبح جب جاگتی تھی تو ابو کب کا سائیکل رکشہ لے کر چلا گیا ہوتا۔ ماں بے چاری تو کولہو کا بیل تھی جو گھر کے کام کاج میں مصروف رہتی تھی۔ نعیمہ نہا دھو کر اپنا میلا کچیلا بیگ اٹھا کر پیدل ہی اسکول چلی جاتی۔ سرکاری اسکول میں اخراجات بہت کم ہوتے تھے۔ اس کا بھائی عمر میں اس سے بہت چھوٹا تھا۔ اس کے ابو نے عزم کیا تھا کہ کچھ بھی ہو وہ اپنی بیٹی کو تعلیم دے کر ہی دم لے گا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے دو بچوں کے بعد نس بندی کروائی تھی۔ ورنہ باقی ہم پیشہ لوگوں کی طرح گھر میں بھوکے ننگے بچوں کی لائن لگ جاتی۔ وہ اپنی بیٹی کو کسی شہزادی سے کم نہیں مانتا تھا۔

اُدھر جھول نکالنے والے لوگوں کا بھی کوئی قصور نہ تھا۔ وہ کسی ہندی فلم کا مکالمہ ہے نا.... 'انٹرٹینمنٹ .....انٹرٹینمنٹ ....انٹرٹینمنٹ ....! غریب کی زندگی کا اس سے بڑھ کر اور کیا انٹرٹینمنٹ ہوسکتا ہے کہ تھکا ماندہ آدمی رات کو گھر لوٹ کر اپنی عورت کے بدن سے حظ اٹھائے، اس کو ہر سال

حاملہ بنائے اور بعد میں ان بچوں کی کلکاریوں سے محظوظ ہوتا رہے۔اس کے پڑوسیوں کے آنگن میں نو دس بچے ہمیشہ کھیلتے کودتے اور ہڑ بونگ مچاتے نظر آتے جبکہ وہ گھر میں اکیلی لڑکی تھی اور اس کا ہمجولی اس کا پانچ برس کا بھائی تھا۔بہر حال انٹرٹینمنٹ کی بات چھوڑ دو، کئی بار مولوی صاحب نے بھی اشرف علی سے کہا تھا کہ بچے خدا کی دین ہوتے ہیں اور ان کا تولد روکنا گناہ عظیم ہے مگر اشرف علی نے نظر انداز کر دیا۔وہ جو سڑک کے کھمبوں پر اشتہار لگے ہوتے تھے 'ایک یا دو بچے....بس!'، آتے جاتے وہ انھیں غور سے پڑھتا اور پھر ان پر عمل کرنے کی سعی کر لیتا۔ ایک روز اس نے چپ چاپ ہسپتال جا کر ڈاکٹر سے مشورہ کر لیا اور بعد میں نس بندی کروالی۔

پیدا ہونے کے لیے نعیمہ اشرف اپنے والدین کی شکر گزار تھی۔اس کا ماننا تھا کہ اس کی پیدائش اتفاق تھی مگر اس کی پرورش کے لیے اس کے والدین نے اپنی زندگی کا سکھ چین نچھاور کر دیا تھا۔انھوں نے وہ سب کچھ کیا جو ان سے ہو سکا اور یہ کیا کم قربانی تھی۔اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ والدین کا قرضہ کیسے اُتار سکتی ہے۔

اشرف علی اپنا رکشہ معمول کی طرح کھینچتا رہا۔اس دوران نعیمہ کالج اور اس کا بھائی اسکول میں داخل ہوئے۔اب تو اشرف علی روزانہ صبح اسے دو کلومیٹر دور بس اسٹاپ پر چھوڑ آتا اور پھر شام کو واپس لے آتا۔امّی گھر کا چولھا پھونکتی رہی۔یہ باتیں اس بے چاری کی سمجھ سے باہر تھیں۔کئی بار اس نے اپنے شوہر سے کہا کہ لڑکی بالغ ہوگئی ہے اب اس کی شادی کر لو ورنہ کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہیں گے۔لیکن وہ نظر انداز کرتا رہا۔اپنی بیٹی کو جواں ہوتے دیکھ کر، وردی پہنے اور بیگ میں کتابیں لیے کالج جاتے دیکھ کر اس کو بڑی مسرت ہوتی تھی۔اُدھر بیٹی تھی کہ اپنے ابو کے خوابوں کو حقیقت میں بدلنے کی ہر دم کوشش کرتی رہی۔ایک روز باپ بیٹی رکشے پر جا رہے تھے کہ باپ نے بیٹی سے کہا۔

''بیٹی، اب تم کس جماعت میں پہنچ گئی ہو؟ اب کالج میں اور کتنے سال لگ جائیں گے؟''

''کیوں ابو، آج آپ یہ سوال کیوں پوچھ رہے ہیں؟''

''دراصل بیٹی مجھے یوں لگتا ہے کہ تم نے بہت سال پڑھائی میں صرف کیے اور اس کا کوئی خاتمہ ہی نظر نہیں آرہا ہے۔''

نعیمہ کو ہنسی آگئی۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کا ابو شاید اب تھک چکا ہے اور وہ اب اس کا بوجھ اٹھا نہیں پا رہا ہے اس لیے جلد از جلد اس سے چھٹکارا پانا چاہتا ہے۔ پھر بھی وہ اس کا دل ٹٹولنے لگی۔

''ابو، کالج میں اب میرا یہ آخری سال ہے۔ ابھی تک تو میں ہر جماعت میں امتیازی پوزیشن لے کر کامیاب ہوئی ہوں۔ اس کے علاوہ تو میں شام کو گھر پر ٹیوشن بھی کرتی ہوں تاکہ کچھ آمدنی ہو۔ اس کے علاوہ اور کیا کر سکتی ہوں۔''

''نہیں بیٹی مجھے روپے پیسے کی کوئی پریشانی نہیں ہے۔ البتہ تمھاری ماں، رشتے دار اور اڑوس پڑوس کے لوگ تمھاری شادی کرانے کی ضد کر رہے ہیں۔ مولوی صاحب بھی مجھ سے اسی بات پر ناراض ہے۔''

نعیمہ نے قہقہہ مار کر جواب دیا۔ ''ابو کن لوگوں کی بات کر رہے ہو۔ سب کے سب کنویں کے مینڈک ہیں۔ آپ نے ہمت نہ کی ہوتی تو شاید میں آج اس مقام تک نہ پہنچ جاتی۔ مجھے آپ پر ناز ہے۔ آپ کے خواب تو اب میری زندگی کا حصہ بن چکے ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ کے خوابوں کی تعبیر آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔ ابو، میرا یہ سال کالج میں ہی گزرے گا اور اس کے بعد میں نے یونیورسٹی جانے کی ٹھان لی ہے جہاں اکانومکس میں ایم اے کرنے کا ارادہ ہے۔ دو سال اور لگ جائیں گے۔ اس کے لیے شاید مجھے یونیورسٹی کے ہوسٹل میں ٹھہرنا پڑے۔ مجھے پوری امید ہے کہ مجھے یونیورسٹی میں وظیفہ مل جائے گا۔ میں کوشش کروں گی کہ آپ پر زیادہ بوجھ نہ پڑے۔ رہا میرا سوال، میں شادی اس کے بعد ہی کرلوں گی اور تب تک کوئی ایسا کام نہیں کروں گی جس سے آپ پر کوئی آنچ آجائے۔''

اشرف علی سن کر بہت خوش ہوا۔ اس کو اپنی بیٹی سے یہی امید تھی حالانکہ اسے یہ معلوم نہ تھا

کہ گھر جا کر اپنی بیوی کو کیا جواب دے۔

ایک برس کیسے بیتا پتا ہی نہ چلا۔ نعیمہ اشرف نے گریجویشن کی ڈگری حاصل کر لی۔ اسے یونیورسٹی میں دوسری پوزیشن ملی تھی ۔ اس کا باپ بہت ہی خوش ہوا۔ اس نے اپنی بیٹی کو آگے پڑھانے کے لیے کمر کس لی۔ کچھ دنوں بعد نعیمہ یونیورسٹی میں ایم اے اکانومکس میں داخلہ لینے میں کامیاب ہوگئی اور وہیں پر ہوسٹل میں رہنے لگی۔ وظیفہ بھی ملنے لگا اور فیس میں بھی رعایت مل گئی۔ تاہم اشرف علی گھر سے کچھ روپیہ بدستور بھیجتا رہا۔

یونیورسٹی میں اس نے ایک عجیب سا ماحول دیکھ لیا۔ لڑکیاں اپنی تعلیم پر کم دھیان دے رہی تھیں اور انڈین سول سروسز کے لیے خود کو تیار کر رہی تھیں۔ ہم جماعت طالبات سے گفتگو کر کے اس نے بھی سول سروسز کا امتحان دینے کا ارادہ کر لیا۔ محنتی تو تھی ہی اس لیے امتحان کی تیاری کرنے کے لیے کوئی کسر باقی نہ رکھی ۔ دوسری طرف وہ ایم اے اکانومکس کے امتحان کی بھی تیاری کر رہی تھی تا کہ اگر سول سروسز میں کامیابی نہ ملے تو کم سے کم ایم اے میں امتیازی نمبرات تو مل سکیں۔ اس کی یہ محنت رائیگاں نہ ہوئی کیونکہ سول سروسز کے لیے اکانومکس کا بھی ایک مضمون تھا اور اس کی ایم اے کی تیاری وہاں بھی کام آئی۔ آخر کار اس نے اپنی سہیلیوں کے ساتھ مل کر سول سروسز امتحان کا فارم بھر لیا۔

اس برس وہ گرمی کی چھٹیوں میں گھر بھی نہ جا پائی کیونکہ اسے امتحانات کی تیاری کرنی تھی۔ آخر کار اس کی یہ لگن اور محنت رنگ لائی۔ پہلے ابتدائی (پریلیمنری) امتحان پاس کیا اور بعد میں اصلی (مین) امتحان میں اس کا نام منتخب فہرست میں آ گیا۔ وہ خوشی سے پھولی نہ سمائی۔ اب بس ایک مرحلہ اور تھا اور وہ اٹھتے بیٹھتے اللہ سے یہی دعائیں مانگتی رہی کہ اسے اس مرحلے میں بھی کامیابی نصیب ہو۔ اس دوران وہ دو تین دن چھٹیاں لے کر اپنے گھر چلی گئی اور اپنے والد کو اپنی حصولیابی سے روشناس کرایا۔ ’’ابو، میں نے سِول سروسز کا امتحان پاس کیا ہے۔ اب صرف انٹرویو باقی رہ گیا ہے۔‘‘

''بیٹی، مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا ہے۔ تم تو ایم اے کرنے گئی تھی تو پھر یہ بیچ میں کیا ہوا۔''

''ہاں ابو، میں تو ایم اے کر رہی تھی مگر اس درمیان میں نے دوسری لڑکیوں کی دیکھا دیکھی میں سول سروسز کے امتحانات کی بھی تیاری کر لی اور اللہ کے فضل سے کامیاب ہوئی۔ میری رینک بہت اوپر ہے اور مجھے امید ہے کہ میں آئی اے ایس میں ضرور منتخب ہو جاؤں گی۔''

''اچھا تو بیٹی، اس سے کیا فائدہ ہوگا؟''

''ابو، اگر میرا انتخاب ہوا تو میں تربیت پا کر پھر ایس ڈی ایم بن جاؤں گی اور ڈسٹرکٹ انتظامیہ میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے تحت کام کروں گی۔''

''میری سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں آرہا ہے۔ خیر مجھے تم پر بھروسہ ہے اور مجھے یقین ہے کہ تم جو کچھ بھی کرو گی، اس سے میری عزت بڑھ جائے گی۔''

نعیمہ اشرف واپس اپنی یونیورسٹی لوٹ آئی اور انٹرویو کال کا انتظار کرنے لگی۔ اس دوران اس نے ایم اے پریویس کا امتحان بھی دے دیا۔ کچھ وقفے کے بعد اس کو انٹرویو کے لیے بلایا گیا۔ اس کے ساتھ دو اور لڑکیوں کو بھی اہل قرار دیا گیا تھا۔ اس لیے تینوں مل کر دہلی پہنچیں اور وہیں یو پی ایس سی کا انٹرویو دے دیا۔ نعیمہ کو خود پر پورا اعتماد تھا، اس لیے بڑے انہماک کے ساتھ انٹرویو بورڈ کے روبرو پیش ہوئی۔ ارکان بورڈ نے کئی سوالات پوچھے، کچھ کا جواب دے پائی اور کچھ کا نہیں مگر کہیں بھی اس نے ایسا محسوس نہ ہونے دیا کہ وہ ڈر رہی ہے یا پھر اسے کچھ آتا نہیں۔ انٹرویو ختم ہونے کے بعد وہ واپس چلی آئی۔

چند مہینوں کے بعد اس کا کال لیٹر آیا اور اس کو لال بہادر شاستری نیشنل اکیڈیمی آف ایڈمنسٹریشن مسوری میں حاضر ہونے کے لیے کہا گیا۔ بات آگ کی طرح پھیل گئی۔ مسوری جانے سے قبل وہ اپنے گاؤں چلی گئی۔ اس سے پہلے ہی وہاں پر کچھ اخبارات اور ٹیلی ویژن چینلوں کے نمائندے پہنچ گئے تھے۔ اس کا گھران کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ کئی رپورٹر اس کے والد اور والدہ سے بات کرنے کے متمنی تھے۔ سوان سے گفتگو کر لی۔ ماں بے چاری تو کچھ نہیں جانتی تھی اس لیے صرف

اتنا کہتی رہی کہ میری بیٹی بہت محنت کرتی تھی اور اس نے مجھے کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا۔ مگر والد تو پھولا نہیں سمار ہا تھا، اس لیے اپنی بیٹی کی تعریف کرتے کرتے رکنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ اس نے تو اپنی بیٹی کے سوبھاؤ اور طور طریقوں پر اپنے خیالات کا اظہار کیا اور کہا کہ اسے ہمیشہ اپنی بیٹی پر بھروسہ تھا کہ وہ اس کا نام روشن کرے گی۔ نعیمہ اشرف سے بھی سوالات پوچھے گئے۔ اس نے بھی اپنی زندگی کی کشمکش پر روشنی ڈالی اور یہ منزل کیسے حاصل کر لی اس کی نشاندہی کر لی۔ بقول نعیمہ اشرف اس کی کامیابی کے پیچھے اس کے ابو کا بہت بڑا ہاتھ رہا ہے۔

ان کے گھر کے اردگرد گاؤں میں رہنے والوں کی بھیڑ جمع ہوگئی۔ سبھی لوگ نعیمہ کو مبارکباد دے رہے تھے حالانکہ بہت سوں کو یہ معلوم نہ تھا کہ آخر اس نے ایسا کیا کام کیا ہے جس پر اتنا شور و غل مچ رہا ہے۔ اسی بھیڑ میں مولوی صاحب بھی نظر آئے اور ایک ٹیلی ویژن چینل کے نمائندے کی نظر اس پر پڑی۔ وہ دوڑ کر مولوی صاحب کے پاس پہنچ گیا اور پوچھا۔ ”جناب مولوی صاحب، گاؤں کی اس بیٹی کی کامیابی کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟“

بے چارہ مولوی کچھ دیر کے لیے یوں ہی دیکھتا رہا مگر جلد ہی اس نے اپنے حواس اکٹھا کر لیے اور اپنے مخصوص لہجے میں گویا ہوا۔ ”نعیمہ بیٹی تو ہمارے گاؤں کی شان ہے۔ سارے گاؤں کو اس پر فخر ہے کہ اس نے اپنی محنت و مشقت سے اتنی بڑی کامیابی حاصل کر لی۔ میں امید کرتا ہوں کہ اس کی تقرری جلد ہی اسی علاقے میں ہوگی اور وہ اپنے اس پس ماندہ علاقے کی ترقی کے لیے کام کرے گی۔ میری دعائیں اس کے ساتھ ہیں۔ آمین!“

دو تین روز کے بعد نعیمہ نے سبھی تیاریاں کر کے اپنے والدین سے رخصت لی اور مسوری کے لیے روانہ ہوگئی۔ وہاں پہلی تنخواہ پاتے ہی اس نے اپنے خرچے کے لیے کچھ روپے نکال کر باقی ساری رقم اپنے والد کو بھیج دی۔ لفافے میں چیک کے ساتھ ایک خط بھی منسلک تھا جس میں لکھا تھا ”ابو، یہ میری پہلی آمدنی ہے اور اس پر صرف آپ کا حق ہے۔“

☆☆☆

شہادت کا صلہ

صابرہ کو یونٹ کی جانب سے بری خبر مل گئی۔ اس کو یونٹ کے دفتر میں حاضر ہونے کے لیے بلایا گیا تا کہ سپاہی عرفان کی لاش اس کے حوالے کر دی جائے۔ عرفان، اس کا شوہر، ملی ٹنٹوں سے لڑتے ہوئے شہید ہو گیا تھا۔

دو دن قبل سیکورٹی فورسز کو معلوم ہوا تھا کہ کشمیر کے ایک دور دراز سرحدی گاؤں میں چند ملی ٹنٹ چھپے ہوئے ہیں۔ اطلاع یہ بھی ملی تھی کہ ایک سرگرم تنظیم کا سرغنہ بھی ان میں شامل ہے۔ خبر پکی تھی اور ایک مقامی مخبر نے دی تھی۔ یونٹ کمانڈر نے اپنے سپاہیوں کو کارروائی کے لیے تیار کیا اور اسی رات سارے علاقے کی گھیرابندی کر لی۔ تاریکی میں ڈوبے ہوئے گاؤں کے ایک مکان سے ہلکی سی روشنی چھن چھن کر باہر آ رہی تھی اور اسی مکان میں دہشت گردوں کے چھپے ہونے کی خبر ملی تھی۔ چہار سو بکتر بند گاڑیوں کی آوا جائی بڑھنے لگی اور منصوبے کے تحت جوانوں کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں مکان کے ارد گرد اپنی پوزیشن لیتی رہیں۔

یونٹ کمانڈر نے لاوڈ سپیکر پر دہشت گردوں کو مخاطب کیا۔ ''ہمارے جوانوں نے تم کو چاروں طرف سے گھیر لیا ہے اور اب تمھارے بچنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس لیے تمھارے لیے بہتر یہی ہوگا کہ تم لوگ اپنے ہتھیار ڈال کر خود کو ہمارے حوالے کر دو۔''

جونہی دہشت گردوں نے محاصرے کا اعلان سنا، انھوں نے بھاگنے کی کوشش کی مگر فرار کے سبھی راستے بند تھے۔ اس لیے انھوں نے مکان کے اندر سے گولیاں اور ہتھ گولے داغنا شروع کر

دیا۔اس طرح باہمی محاربے کا اعلان ہوگیا۔سیکورٹی فورسز نے ،جن میں فوجی دستے ،آر آر کے جوان اور مقامی پولیس کے سپاہی سبھی شامل تھے، جوابی کارروائی میں گولیاں چلائیں اور مشین گنوں سے گولے برسائے جو مکان کو رات بھر چھلنی کرتے رہے۔ پھر بھی سحر تک کچھ فیصلہ نہ ہوسکا کیونکہ وقفے وقفے سے مکان کے اندر سے گولیاں آرہی تھیں۔ ردِعمل میں فوج نے بھی مکان پر گولیاں اور بم برسانے میں کوئی کوتاہی نہ برتی۔ البتہ سیکورٹی فورسز کو یہ پکا معلوم نہیں تھا کہ گھرے ہوئے ملی ٹنٹوں کے پاس گولی بارود کا کتنا ذخیرہ ہے؟ ان کو اندیشہ تھا کہ اگر کہیں انھوں نے پیش قدمی کرلی اور دہشت گردوں کے پاس قیاس سے زیادہ اسلحہ اور گولہ بارود موجود ہو تو ان کے جوان خواہ مخواہ میں شہید ہوجائیں گے۔فوجیوں کی ہمیشہ یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ اس بات کا اندازہ لگائیں کہ دشمن کے پاس کتنی نفری، طاقت اور گولی بارود ہے تا کہ ان کے اپنے سپاہیوں کی ہلاکتیں کم سے کم واقع ہوں۔

صبح تک مکان کی باہری شکل وصورت ایک چیچک زدہ انسان کے مانند ہوگئی۔ پو پھٹتے ہی یونٹ کمانڈر نے دوبارہ اعلان کر دیا۔ ’’تم لوگ چاروں طرف سے گھر چکے ہو۔ بھاگنے کے سبھی راستے بند ہو چکے ہیں۔ ابھی بھی تمھارے پاس موقع ہے کہ تم ہتھیار ڈال دو اور خود کو ہمارے حوالے کردو۔ ہم تمھارے ساتھ رعایتی کارروائی کریں گے، پولیس تم کو اپنی حفاظت میں لے کر کورٹ میں پیش کرے گی۔ ابھی بھی وقت ہے، سنبھل جاؤ۔‘‘

دوسری جانب سے کوئی جواب نہ ملا۔ اس کے برعکس انھوں نے مزید گولی باری کی جس کا مطلب یہ تھا کہ ہمیں تمھاری تجویز منظور نہیں ہے۔ دن بھر اعلانات ہوتے رہے اور گولیاں باری باری چلتی رہیں۔تاہم وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مکان کے اندر سے گولیوں کی تعداد میں کمی آتی گئی اور ایسا محسوس ہونے لگا کہ اب ان کے پاس زیادہ وقت تک گولی بارود نہیں بچا ہے۔ یونٹ کمانڈر نے بڑے صبر سے کام لیا اور رات کا انتظار کرتا رہا۔ آدھی رات کے وقت اس نے مکان پر دعویٰ بولنے کا فیصلہ کرلیا۔ شبینہ روشنیوں کی مدد سے فوج کی ایک تربیت یافتہ ٹکڑی نے آگے بڑھ کر مکان کا محاصرہ کیا۔ کچھ دروازوں اور کھڑکیوں کے عقب میں چھپ گئے اور چند ایک مکان کی

چھت پر چڑھنے کی کوشش کرنے لگے۔ اتنے میں اندر سے دو ملی ٹنٹ سفید جھنڈا لیے باہر آ گئے۔ فوجیوں نے اسے سرنڈر سمجھ کر گولیاں چلانا بند کر دیا۔ مگر وہ تو دھوکے کی ٹٹی ثابت ہوئی جس کی آڑ میں خودکش ملی ٹنٹوں نے سامنے نظر آ رہے فوجی جوانوں پر حملہ کر دیا۔ نتیجتاً سیکورٹی فورسز نے جوابی کارروائی میں گولیاں چلائیں اور دونوں ملی ٹنٹوں کو مار گرایا۔ مگر تب تک دو فوجیوں کو گولیاں لگ چکی تھیں جن میں سے ایک سپاہی عرفان بھی تھا۔ دونوں کو طبی امداد پہنچانے کے لیے ترنت ملٹری ہسپتال پہنچایا گیا۔

اِدھر کارروائی لگاتار جاری رہی۔ اس رات سیکورٹی فورسز نے پانچوں ملی ٹنٹوں کو ہلاک کر دیا اور سحر ہونے تک مطلع صاف ہو گیا۔ اس کے بعد مکان کی پوری تلاشی لی گئی، ملی ٹنٹوں کی لاشیں نکالی گئیں اور ان کو دفن کرنے کی کارروائی کی گئی۔ مکان سے نہ صرف ہتھیار بلکہ کئی اہم دستاویز بھی حاصل ہوئے جو مزید تفتیش کے لیے دفتر روانہ کیے گئے۔

ہسپتال میں عرفان اور اس کا ساتھی گورمیت سنگھ زندگی کی آخری لڑائی لڑ رہے تھے۔ ڈاکٹروں نے بہت کوشش کی کہ ان کو کسی بھی طریقے سے بچایا جائے مگر وہ ناکام رہے۔ اس لیے ان کی لاشوں کو یونٹ ہیڈ کوارٹر بھیج دیا گیا۔ صابرہ کو یہیں سے پیغام بھیج دیا گیا کہ اس کا خاوند ملی ٹنٹوں سے لڑتے لڑتے شہید ہو گیا ہے اور اگر وہ چاہے تو لاش کو ملٹری گاڑی میں گھر لے جا کر اس کو آبائی قبرستان میں دفن کر سکتی ہے ورنہ اس کے کفن دفن کا انتظامیہ یونٹ کا انتظامیہ کرے گا۔

یوں بھی صابرہ کی دائیں آنکھ کئی دنوں سے پھڑک رہی تھی۔ اسے اندیشہ تھا کہ کہیں کوئی بُری خبر سننے کو نہ ملے۔ رات میں کئی بار وہ ڈراونے سپنے دیکھتی اور اس کے بدن میں کپکپی ہوتی۔ کبھی وہ خواب میں اپنے محبوب کو گھر میں داخل ہوتے دیکھتی، اس کی بانہوں میں سمانے کی کوشش کرتی مگر وہ یکایک غائب ہو جاتا اور بہت ڈھونڈنے کے بعد بھی نہیں ملتا۔ اس وقت اس کا سارا جسم کانپ اٹھتا، وہ جاگ جاتی اور دوسری چارپائی پر سوئے ہوئے دونوں بچوں کو کس کر گلے لگاتی۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا دریا رواں ہو جاتا۔ وہ اپنے آپ سے سوال کرتی کہ اس کا شوہر اس سے

پہلے بھی کئی مہموں پر جاتا رہا پھر آج کیا بات ہے کہ اسے ڈراونے خواب پریشان کر رہے ہیں؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ آنے والی مصیبتوں کے سائے پہلے ہی پڑ رہے ہیں۔ وہ سجدے میں گر جاتی اور دعا کرتی۔ ''اے خدا رحم، مجھ پر رحم کر، میرے عیال پر رحم کر۔''

کئی بار اسے وہ دن یاد آتا جب اس کی سہیلی حمیدہ کا شوہر جنگ میں شہید ہو گیا تھا۔ سارا گاؤں سوگوار تھا۔ ہمالہ کی برفانی بلندیوں سے حمیدہ کے بہادر شوہر، گلریز کی میّت خصوصی تابوت میں لائی گئی تھی اور بذریعہ طیارہ گاؤں تک پہنچائی گئی تھی۔ درآمد شدہ تابوت کی قیمت کئی لاکھ روپے بتائی گئی اور اس کو ترنگے سے ڈھک لیا گیا تھا۔ کئی بڑے افسر ہیلی کاپٹر سے اترے تھے اور انھوں نے بڑے اہتمام کے ساتھ گلریز کے جنازے کو حمیدہ کے حوالے کر دیا تھا۔ تکفین و تدفین کا انتظام بھی فوج نے بڑے اہتمام سے کیا تھا۔ وہاں جتنے لوگ موجود تھے ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ صابرہ کی آنکھیں بھی پرنم تھیں مگر نہ جانے کیوں اس کو گلریز کے بدلے اپنے شوہر عرفان کی تصویر بار بار سامنے آرہی تھی۔ وہ سوچ و فکر کے اتھاہ سمندر میں ڈبکیاں لگا رہی تھی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ گلریز کے بدلے عرفان لڑائی میں شہید ہو چکا ہے اور فوجی افسروں نے اس کا جنازہ بذریعہ طیارہ لایا ہے اور بڑے اہتمام سے عرفان کا جنازہ اسے سونپ رہے ہیں۔ ایک جانب اس کو عرفان کی جدائی کا غم ستا رہا تھا لیکن دوسری جانب اسے فخر محسوس ہو رہا تھا کہ اس کا شوہر اپنے ملک کے لیے لڑتے لڑتے شہید ہوا اور اس کے جنازے کو اس تک پہنچانے کا سرکار نے بہت اچھا بندوبست کیا ہے۔ وہ تہہ دل سے سرکار کی شکر گزار تھی کہ انھوں نے اس طرح اپنے سپاہیوں کی عزت افزائی کی اور شہید ہونے کے بعد ان کو عزت و احترام کے ساتھ گھر پہنچایا۔ دریں اثنا حمیدہ کے منہ سے ایک زوردار چیخ نکلی جس کو سن کر صابرہ خواب سے جاگ اٹھی، اس نے اپنے سر کو زور سے جھٹک دیا اور پھر خود کو کوسنے لگی کہ کیسی منحوس باتیں سوچ رہی ہے۔ اس نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور پروردگار سے التجا کی کہ اس کے خاوند کو صحیح سلامت گھر پہنچائے۔ اس کی دعا قبول ہوگئی اور جنگ ختم ہوتے ہی عرفان چھٹی لے کر گھر آیا۔

دوسرے مہینے ملک میں پارلیمنٹ کے الیکشن ہوئے۔ کئی سیاسی رہنما اس کے گاؤں آئے اور گلریز کی قبر پر پھول چڑھاتے رہے۔ ملک بھر میں شہیدوں کے مزاروں پر میلے لگتے رہے۔ سیاسی رہنما جہاں بھی جاتے فوجیوں کی شہادت کا چرچا کرتے۔ جنگ میں اپنی فوج کی فتح یابی مرکزی موضوع بن گئی اور انجام کار برسر اقتدار پارٹی کی سرکار دوبارہ بن گئی۔

بہر حال آج سب کچھ بدلا بدلا سا نظر آرہا تھا۔ نہ وہ احتشام تھا اور نہ ہی وہ طمطراق، نہ ہیلی کاپٹر کی گڑگڑاہٹ سنائی دے رہی تھی اور نہ ہی فوجی افسروں کی ریل پیل، نہ وہ لاکھوں کا امپورٹڈ تابوت تھا اور نہ ہی عکس بندی کا عمل۔ اس کے برعکس صابرہ کو یونٹ میں بلایا گیا اور میّت لینے کے لیے کہا گیا۔ اسے ایڈ جوٹنٹ کے کمرے میں انتظار کرنے کو کہا گیا۔ وہ حیران تھی۔ دائیں بائیں کوئی ہمدرد آنسو پونچھنے کے لیے بھی نہ تھا۔ وہ کمرے میں اکیلے سسکیاں بھرتی رہی۔ اُدھر یونٹ کے افسر کاغذی کارروائی میں مصروف تھے۔ جنازہ تو تیار تھا، ملٹری گاڑی بھی تیار تھی مگر پنشن وغیرہ کے کچھ کاغذات تیار کرنا اور ان پر صابرہ کے دستخط حاصل کرنا باقی رہ گیا تھا۔

خیالات کا کارواں اس کے دماغ میں اتھل پتھل مچا رہا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ "آج اس کے رفیق حیات کے آخری سفر کے لیے ویسا انتظام کیوں نہیں ہے جیسا اس کی سہیلی کے خاوند کے ٹائم پر کیا گیا تھا؟ کیا اس کا شوہر فوجی جوان نہیں تھا؟ کیا ملی ٹنٹوں سے مقابلہ کرنا دشمن ملک سے مقابلہ کرنے کے برابر نہیں تھا؟ کیا وہ شہید نہیں ہوا تھا؟ کیا وہ ان سب چیزوں کا حق دار نہیں تھا جن کا مظاہرہ گلریز کے مرنے کے وقت کیا گیا تھا؟" اسے کون سمجھاتا کہ اس سال نہ پارلیمنٹ کے الیکشن تھے اور نہ ہی ریاستی اسمبلی کے۔ پھر یہ سب اہتمام کیوں اور کس لیے کیا جاتا؟ شہیدوں کا مرتبہ بھی موسموں کی طرح رنگ بدلتا ہے۔ الیکشن کے دنوں میں انھیں سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا ہے، ان کی تعظیم کی جاتی ہے اور ان کی شہادت کی مثالیں دی جاتی ہیں۔ مگر جب الیکشن نہیں ہوتے ہیں تو ان کی شہادت عام اور روزمرہ کا حادثہ بن جاتی ہے۔ سوچتے سوچتے اس کا سر بھاری ہونے لگا پھر بھی حالات کے مدنظر وہ خاموش رہی۔ اس کا حلق سوکھ رہا تھا اس لیے سامنے کھڑے سپاہی سے

پانی کا ایک گلاس لانے کی درخواست کی۔

کاغذی کارروائی ہونے کے بعد اسے سارے متعلقہ کاغذات سونپ دیے گئے اور ملٹری کی ون ٹن گاڑی میں بٹھایا گیا۔ پیچھے سپاہی عرفان کی لاش بڑے احترام کے ساتھ رکھی گئی۔قریب ایک گھنٹے میں وہ اپنے شہید سپاہی کو لے کر گھر پہنچی جہاں اس کے پڑوسی اس کا بے صبری سے انتظار کر رہے تھے۔
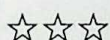
خوابوں کا کہرا

''جی چاہتا ہے کہ آتم ہتیا کرلیں!''

''نہیں؟ میں نے تو کسی بچے کو گود لینے کا من بنالیا ہے۔ایک یتیم بچے کو سہارا تو ملے گا۔''

''بچے کو....!جب بھگوان ہی نے نہیں دیا تو پرائے بچے کو گود لے کر کیا کریں گے؟''

''مجھے تو بس یہی ایک راستہ نظر آرہا ہے۔نراش ہونے سے کیا فائدہ۔''

''ٹھیک ہے۔جیسے تمھاری مرضی!''

''میں نے تو اس کا نام بھی سوچ رکھا ہے۔''

''واااااہ.....بھلا کیا نام رکھو گی؟''

''وِکاس.....!''

''واہ کیا نام سوچ رکھا ہے۔تم بہت عقلمند بنتی جارہی ہو۔آج کل بڑا چرچا ہے اس نام کا۔ رام...کرشن...نرائن...یہ سب نام اب وِکاس کے سامنے پھیکے پڑتے نظر آرہے ہیں۔چلو...اچھا ہے۔''

''ایشور نے میری کوکھ سونی رکھی،شاید اس میں اس کی کوئی منشا ہوگی۔اب میں وکاس کو ہی گود لوں گی۔چلیے کسی یتیم خانے سے مانگ کر لے آئیں گے۔''

دونوں میاں بیوی نزدیک ہی ایک یتیم خانے پہنچ گئے اور وہاں کے منتظم سے التجا کی کہ ایک بچہ گود لینے کے لیے انھیں دے دیں۔کئی بچے دکھائے گئے۔ان میں سے انھوں نے ایک

لڑکے کو پسند کیا۔ حالانکہ ان کا دل پہلے ایک لڑکی پر آ گیا تھا مگر انھوں نے اس کا نام وِکاس سوچ رکھا تھا اس لیے لڑکا لینا ہی ضروری تھا۔ اس پر طرّہ یہ کہ لڑکی لینے سے ان کی ذمہ داریاں بہت بڑھ جاتیں، اس کی دیکھ بھال، پڑھائی اور پھر شادی کے لیے جہیز اکٹھا کرنا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس لیے بات لڑکے پر ہی ٹھہر گئی۔ پھر لکھا پڑھی ہوگئی اور وہ خوشی خوشی وِکاس کو گھر لے آئے۔ انھیں کون سمجھاتا کہ آج کل لڑکا پالنا بھی اتنا ہی کٹھن کام ہے جتنا لڑکی پالنا۔ وِکاس کی پرورش، اس کی تعلیم، پہلے اسکول، پھر کالج اور بعد میں یونیورسٹی یا کسی پیشہ ورانہ کالج میں داخلہ، پھر اس کے لیے صحیح لڑکی کا انتخاب جوان کے گھر کو عبادت گاہ سمجھتی.....اور بھی بہت کچھ۔ اس بات کا مطلب انھیں دھیرے دھیرے سمجھ آنے لگا مگر اب تو فیصلہ ہو چکا تھا۔ خیر گاؤں کے لوگ بھی بہت خوش ہوئے کہ کیول بھیا اور کانتی بھابھی نے ایک بچہ گود لے لیا ہے اور اس کا نام وِکاس رکھ لیا ہے۔

ایک روز اس گاؤں میں ایک سوامی جی آئے۔ چہار سو ان کا بہت چرچا تھا۔ راستے میں انھیں وِکاس مل گیا۔ سوامی جی نے اسے گاؤں کے مکھیا کے گھر کا راستہ پوچھا جو اس نے بتا دیا۔ بتایا کیا وہ تو خود ان کے ساتھ وہاں تک چلا گیا۔ راستے میں دونوں کے بیچ گفتگو ہوئی۔ سوامی جی اس ننھے منے بچے سے بہت خوش ہوئے۔ مکھیا سے نپٹنے کے بعد وہ اس لڑکے کے ساتھ واپس لوٹے اور راستے میں اپنی خواہش ظاہر کی کہ میں تمھارے ماں باپ کے درشن کرنا چاہتا ہوں۔ وِکاس حیران ہوگیا کہ سوامی جی کا اس کے غریب ماں باپ سے کیا کام؟ پھر بھی وہ ان کی خواہش پوری کرنے کے لیے انھیں اپنے گھر لے گیا۔ سوامی جی کیول رام اور کانتی دیوی سے بڑے تپاک سے ملے۔ ایسا لگا جیسے برسوں کی جان پہچان ہو۔ کانتی دیوی جلدی سے خاطر تواضع میں لگ گئی۔ پوچھا، چائے پئیں گے یا دودھ؟ جواب ملا، چائے چلے گی۔ اس نے جلدی سے چائے بنالی اور گھر میں بنی ہوئی کچھ مٹھڑیوں کے ساتھ سامنے رکھ دی۔ اس دوران سوامی جی کیول رام سے بات چیت کرتے رہے۔ گھر گرہستی کے بارے میں پوچھنے کے بعد وہ اصلی مدعا پر آ گئے۔

''کیول جی، یہ آپ کا بالک بہت ہی ہونہار ہے۔ یہ تم لوگوں کی ہی نہیں بلکہ سارے

دیش کی قسمت بدل کے رکھ دے گا۔''

''بھگوان کی کرپا ہے سوامی جی۔ ہم تو غریب آدمی ٹھہرے۔ اس بارے میں کبھی کچھ سوچا ہی نہیں۔ میرے تو آبائی کھیت ہیں جن سے گھر کا گزارا چل رہا ہے۔ اس کے علاوہ مجھے لوہار کا کام بھی آتا ہے جو میں خالی وقت میں کرتا ہوں۔ اس سے بھی تھوڑی بہت آمدنی ہوتی ہے۔ میں نے تو سوچا ہے کہ وِکاس کو بھی اسی کام میں لگالوں تا کہ میری مدد ہو سکے۔ سوامی جی ہم غریبوں کی نظر تو محدود ہوتی ہے۔''

''نہیں کیول رام، تم غلط سوچ رہے ہو۔ وِکاس تو ہیرا ہے ہیرا۔ لوگ تو ایسے ہیرے کی تلاش میں رہتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اس ہیرے کو میرے حوالے کر دو تا کہ میں اس کو اپنے ا سکول میں ڈال دوں اور یہ تعلیم پا کر دیش کی سیوا کرے۔ یہاں سے شہر تو دور ہے نہیں، وہاں میرے مٹھ کا ایک بہت بڑا اسکول چل رہا ہے۔ اس کی پڑھائی کا سارا انتظام وہیں ہوگا۔ تم لوگوں کو اس پر کچھ خرچ کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ سال میں گرمیوں کی چھٹیوں کے دوران گھر آیا کرے گا۔''

ماں ان کی گفتگو سن رہی تھی۔ اس کے کان کھڑے ہو گئے۔ جس بچے کو اس نے کئی برس پالا پوسا اس کو اپنے سے الگ کرنا اب مشکل تھا۔ ابتدا میں بچے کو گود لینا اس کی مرضی کے خلاف تھا۔ وہ بہت ہچکچاتی رہی کیونکہ وہ سمجھتی تھی کہ اس کی قسمت میں بچے کا سکھ لکھا ہی نہیں ہے تو پھر کیوں بھگوان کی مرضی کے خلاف کوئی قدم اٹھایا جائے۔ مگر جب وکاس کے لمس نے اس کی ممتا کو جگایا تو وہ اس کے موہ میں دیوانی ہو گئی۔ وکاس کے بغیر جینے کے بارے میں اب وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اس نے اپنے پتی کو انکار کرنے کے لیے آنکھ سے اشارہ کیا مگر سوامی جی کے سامنے اس بے چارے کے منہ پر جیسے تالا لگ گیا۔ اس لیے کانتی دیوی سے رہا نہ گیا، بولی۔ ''سوامی جی، اس بارے میں اتنی جلدی فیصلہ کرنا ذرا کٹھن ہے۔ اکلوتا بیٹا ہے نا اس لیے اپنے سے الگ کرنا کچھ مشکل سا ہے۔ میرا وچار ہے کہ ہمیں دو تین دن کی مہلت دے دیں۔ پھر ہم اپنا فیصلہ سنائیں گے۔''

''دیوی جی۔ میں سمجھ سکتا ہوں۔ ایک ماں ہونے کے ناتے اپنے اکلوتے بیٹے کو خود سے جدا کرنا بہت مشکل ہے۔ مگر جیسا میں نے کہا کہ اس بچے کی قسمت بن جائے گی۔ اس لیے آپ اس بات پر آرام سے غور کرلیں۔ میں چار پانچ دن کے بعد پھر آؤں گا اور تب تک آپ اس بارے میں فیصلہ کرلیں۔''

میاں بیوی آپس میں کئی روز بحث کرتے رہے۔ کانتی دیوی تو لگاتار انکار کررہی تھی مگر کیول رام کے سامنے اس کی ایک نہ چلی۔ وہ اس بات پر مصر تھا کہ بیٹا تعلیم پاکر ایک روز ہم سب کا نام روشن کرلے گا۔ آخر کار فیصلہ یہ ہوا کہ بیٹے کو سوامی جی کے حوالے کردیا جائے۔ اور چند دن کے بعد ایسا ہی ہوا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ تعلیم انسان کے دماغ کو روشن کرتی ہے مگر تعلیم کی بھی تو قسمیں ہوتی ہیں۔ جو لوگ تعلیم کے زیور سے آراستہ نہیں ہوتے وہ ان پڑھ، جاہل اور گنوار رہتے ہیں۔ وہ حشرات الارض کی مانند زندگی بسر کرتے ہیں۔ انھیں خود غرض چالباز سیاست دان ریوڑ کی طرح اپنے مفاد کے لیے ہانکتے رہتے ہیں۔ اس کے برعکس جو تعلیم موجودہ دور کے تقاضوں کو پورا کرتی ہے، انسان کو زیرک بناتی ہے، سائنس اور تکنالوجی سے لیس کرتی ہے اور معاصر زندگی کی ضرورتوں سے آگاہ کرتی ہے وہ انسان کو مرد کامل بناتی ہے۔ ایسے لوگ زندگی نہ صرف جیتے ہیں بلکہ معاشرے کے لیے کچھ تعمیری کام بھی کرتے ہیں۔ لیکن پڑھے لکھے لوگوں کی ایک اور قسم ہے، وہ ہے ناقص تعلیم یافتہ جن کو انگریزی میں Maleducated کہتے ہیں۔ یہ لوگ خود کو تعلیم یافتہ سمجھتے ہیں مگر اصل میں تعلیم یافتہ نہیں ہوتے ہیں۔ انھوں نے زندگی بھر دو چار مذہبی، سیاسی یا پھر نظریاتی کتابیں پڑھی ہوتی ہیں اور سمجھتے ہیں کہ انھوں نے بحر علم پار کرلیا ہے اور اب انھیں کسی اور علم کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ ان چند کتابوں کو ابتدا و انتہائے آگہی سمجھتے ہیں۔ ان کی زندگی اکثر تخریبی کاموں میں بسر ہوتی ہے۔

وِکاس کو سوامی جی نے اپنے اسکول میں داخل کرادیا اور اس کے رہنے کا انتظام اسکول

کے ساتھ بنے ہوئے ہوسٹل میں کر دیا۔ وِکاس یہ سب سویدھائیں دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ صبح اٹھنا، اجتماعی دعا اور جسمانی ورزش میں شریک ہونا اور پھر اسکول جانا اس کا معمول بن گیا۔ شام کو بھی اسکول کے بعد وہ دوسرے طلبہ کے ساتھ ہوسٹل کی نرسری میں سبزیاں اگانے اور میوے کے پیڑوں کی دیکھ بھال کرنے میں وقت صرف کرتا تھا۔ دن بھر اسکول میں پڑھائی ہوتی جس میں زیادہ تر دیش کی سنسکرتی اور مذہب پر دھیان دیا جاتا اور اس بات پر زور دیا جاتا کہ ہماری سبھیتا یورپ سے کہیں زیادہ بلند تر ہے۔ یورپ نے جو کچھ بھی تلاشا ہے وہ سب ہمارے شاستروں میں پہلے ہی سے موجود تھا۔ اکثر اس بات پر زور دیا جاتا کہ مغربی تعلیم کے سبب ہمارے سماج کا تنزل ہوا ہے اور دنیا میں مہلک ہتھیار اور بیماریاں اسی مغربی تعلیم کی بدولت پیدا ہوئی ہیں۔ نتیجتاً وِکاس انہی بھول بھلیوں میں کھو گیا۔ ایک ایسا ذہن، جو کچھ کر دکھانے کے قابل تھا گر اس کو سائنس اور تکنالوجی کے میدان میں صحیح رہنمائی ملتی، دھیرے دھیرے کُملانے لگا تھا۔ یہاں تو اس کی ساری قوتیں ماضی کی وصولیابیوں کا گن گان کرنے میں صرف ہو رہی تھیں۔ جب وہ سن بلوغ کو پہنچ گیا تو اس کی ساری توانائی دھرم کو بچانے میں خرچ ہونے لگی۔ کہیں مندر مسجد کے جھگڑے، کہیں گئو رکھشا، کہیں دھرم پریورتن اور کہیں لَو جہاد۔ وہ اس میدان میں اکیلا نہیں تھا بلکہ اس کی عمر کے بہت سارے لڑکے اس میدان میں سرگرم عمل تھے۔

اُدھر دوسرے مذاہب کے لڑکے بھی اپنے اپنے مذہب کے تحفظ کے لیے تلواریں نکالنے لگے تھے۔ اس طرح کئی جوانیاں ان فضول باتوں میں ضائع ہو رہی تھیں۔

وِکاس کی جسمانی نشو ونما تو ہو رہی تھی مگر اس کی ذہنی نشو ونما پر گرہن لگ چکا تھا۔ وِکاس کو جب بھی موقع مل جاتا وہ فکر و تردّد میں پڑ جاتا کہ اس کی زندگی بے معنی ہو رہی ہے۔ وہ کچھ کرنا چاہتا تھا۔ اپنے دیش سے غریبی دور کرنا چاہتا تھا۔ لوگوں کو جہالت اور ناخواندگی کے اندھیرے سے باہر نکالنا چاہتا تھا۔ وہ اپنے ملک کو مغربی ممالک کی طرح خوشحال دیکھنا چاہتا تھا۔ مگر اس کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ وکاس قدامت پرستی اور توہم پرستی کے نرغے میں پھنس چکا تھا اور اس میں سے

نکل نہیں پا رہا تھا۔ وہ تعلیم یافتہ تھا۔ اس نے گریجویشن کی ڈگری حاصل کر لی تھی مگر ایسی ڈگریاں تو اس کے دیش میں ہرایرے غیرے نتھو خیرے کے پاس تھیں۔ اس کے دیش کا تعلیمی نظام معیار کے بدلے مقدار کی نذر ہو چکا تھا۔ اس کے باوجود لوگ اسے بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے یہاں تک کہ وہ الیکشن میں ایم ایل اے اور پھر کابینہ کا وزیر بھی بن گیا۔ جب وہ اپنے گاؤں جاتا تو اس کے والدین فخر سے اپنا سر اونچے کرتے تھے اور گاؤں کے لوگ اس کے اردگرد جمع ہو جاتے۔ کئی لوگ فریاد کرتے کہ شہر سے گاؤں تک سڑک بنواؤ، بجلی پانی کا انتظام کراؤ، کسانوں کے قرضے معاف کراؤ تا کہ کھیتی باڑی کی طرف زیادہ دھیان دے سکیں۔ مگر وہ سن کر ان سنی کرتا کیونکہ اس کے پاس کچھ اور ہی امور تصفیہ طلب تھے جن کو ترجیح دینا اس کے لیے ضروری تھا۔

ایک روز وہ یونہی رشی کیش چلا گیا کہ اس کی ملاقات ایک پہنچے ہوئے سادھو مہاراج سے ہوئی۔ آپسی گفتگو کے دوران سوامی جی کو لگا کہ یہ نوجوان اپنے راستے سے بھٹک گیا ہے۔ اس نے وِکاس کو اپنے من میں ڈوب کر سراغِ زندگی پانے کی ہدایت کی۔ سوامی جی کو احساس ہوا کہ یہ آدمی انسان کی بھلائی کے لیے کچھ کرنا چاہتا ہے مگر اسے بیڑیوں میں باندھ دیا گیا ہے۔ اب اس کے آزاد ہونے کا ایک ہی طریقہ ہے اگر وہ اپنی قوت کو پہچان لے اور زندگی کا اصلی مقصد سمجھ لے۔ وِکاس سوامی جی کی باتوں سے بہت متاثر ہوا اور اس کے ساتھ چلنے کے لیے آمادہ ہوا۔ کئی دن وہ دونوں ہمالیہ کی وادیوں میں بھٹکتے رہے اور پھر سوامی جی کی کٹیا تک پہنچ گئے جو بستی سے بہت دور تھی۔ وہاں پر اس نے سادھو مہاراج کی شاگردی قبول کر لی اور ساتھ ہی گیروے کپڑے دھارن کر لیے۔ اس نے ویدوں اور ان سے جڑی دوسری مذہبی کتابوں کا از سرِ نو مطالعہ کر لیا۔ وہ حیران ہوا کہ اس نے اس سے قبل جو کچھ سیکھ لیا تھا وہ ان مقدس کتابوں کا مطلب ہرگز نہیں بلکہ ان کا مطلب تو دنیا کو ایک کنبہ ماننا ہے اور سبھی انسانوں کو بھائی بہن سمجھنا ہے۔ انسانیت ہی انسان کا سب سے بڑا دھرم ہے۔ دنیا میں امن و امان قائم کرنا ہی ان مقدس کتابوں کی غرض و غایت ہے۔ وہ جوں جوں کتابوں کا مطالعہ کرتا رہا اور اپنے گورو سے ان کے بارے میں پوچھتا رہا اس کا نظریہ بدلتا رہا اور

اس کی زندگی میں ایک انقلاب برپا ہوا۔ اب وہ بستی میں جانا نہیں چاہتا تھا بلکہ ایکانت میں رہنا چاہتا تھا۔ اس کے لیے اب مادی اثاثہ اور مقام و مرتبہ کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔

اُدھر جب سے وِکاس غائب ہوا تھا لوگ اسے ڈھونڈ رہے تھے۔ انھیں اس کے بارے میں کوئی خبر نہیں مل رہی تھی۔ انھیں ایسا لگ رہا تھا کہ یا تو وِکاس کسی ندی میں ڈوب چکا ہے یا پھر جنگل میں کسی خونخوار حیوان کا نوالہ بن چکا ہے۔ انھیں محسوس ہو رہا تھا کہ اب وِکاس کا واپس آنا ممکن نہیں ہے۔ دھیرے دھیرے وہ اس کو بھول گئے۔ سچ بھی یہی ہے کہ جب کسی چیز کی سماج کو طلب نہیں رہتی وہ ان کے لیے معدوم ہو جاتا ہے۔ وِکاس اپنے ماں باپ، گاؤں اور ہمجولیوں سے بہت دور چلا گیا تھا۔

برسوں بعد اس نے اپنے گاؤں کی خبر لینے کی ٹھان لی۔ اس کا حلیہ بدل چکا تھا۔ جٹادھاری، لمبی داڑھی، چہرے پر فکر کی شکنیں اور ماتھے پر عرفان کا پرتو۔ اس نے پرانی گلیوں کے چکر لگائے مگر وہاں اس کو کوئی پہچان ہی نہ پایا یہاں تک کہ اس کے والدین، جواب بوڑھے ہو چکے تھے، وہ بھی اسے پہچان نہ سکے۔ اسے اپنا تعارف یوں دینا پڑا۔

''باپو، میں سوامی وِکاس آنند ہوں، آپ کا کھویا ہوا پُتر۔ دراصل میں نے دنیا تیاگ دی ہے۔''

ماں باپ نے اس کو آشیرباد دی اور اس کو حیرانی سے دیکھتے رہے۔

پھر وہ اس اسکول چلا گیا جہاں اس نے تعلیم پائی تھی۔ وہاں بھی اس کو کسی نے نہیں پہچانا۔ جس سوامی جی نے اس کو اسکول میں داخل کرایا تھا وہ بھی اب بوڑھا ہو چلا تھا اور اس کو پہچان نہ سکا۔ اس کے سامنے بھی اس کو اپنا تعارف پیش کرنا پڑا۔

''سوامی جی، میں ہوں وِکاس آنند جس کو آپ نے کبھی اس اسکول میں داخل کرایا تھا۔ دنیاوی تعلیم دینے کے لیے۔ لیکن وہ مجھے راس نہیں آئی۔ اس لیے میں نے روحانی تعلیم حاصل کرنے کی ٹھان لی۔ تب سے میں اپنی کھوج میں نکل پڑا ہوں۔''

اس کے بعد وِکاس آنند نے اپنے جھولے میں سے ایک ضخیم کتاب نکالی اور سوامی جی کو پیش کی۔ ٹائٹل تھا۔ 'شریمد بھگوت گیتا اور اس کا اَرتھ' لیکھک سوامی وِکاس آنند۔

سوامی جی نے کتاب اپنے نحیف ہاتھوں میں تھام لی۔ وہ اپنی خوشی کو چھپا نہ سکا اور پھر اپنا سیدھا ہاتھ وِکاس آنند کے سر پر رکھ کر کہنے لگا۔ ''میں تمھارے بھوشیہ کے پریاسوں میں ہر سپھلتا کی کامنا کرتا ہوں۔''

سوامی جی نے اپنا چشمہ صاف کیا جیسے کوئی خواب دیکھ رہا ہو۔ وِکاس کا حلیہ دیکھ کر اسے یقین ہی نہ ہو رہا تھا۔ وہ اس کو بہت دیر تک تعجب سے دیکھتا رہا۔

آس پاس سبھی لوگ سوامی وِکاس آنند کو ٹکر ٹکر دیکھ رہے تھے۔

آخرکار وِکاس آنند نے سوامی جی سے رخصت لی اور اس کے بعد پہاڑوں میں ایسے کھو گیا کہ پھر کبھی واپس آنے کا نام بھی نہیں لیا۔

اجاڑ مکان کی آتم کتھا

''تم مجھ پر شک کر رہے ہو۔ مجھے بے جان شئے سمجھ رہے ہو۔ ذرا میرے اندر جھانک کر تو دیکھ لو۔''

''اینٹ، پتھر، گارے اور لکڑی سے بنے ہوئے کھنڈر کو بے جان نہ سمجھوں تو اور کیا سمجھوں؟''

''تم پھر وہی غلطی کر رہے ہو۔ تمھاری سوچ ناقص ہے۔ میں اس جھیل کی مانند ہوں جس کے اندر زندگی برسوں کروٹیں لیتی رہی ہے۔ جیتی جاگتی ایک دنیا آباد تھی میرے اندر۔ نامیاتی اجسام کا ایک ہجوم سمایا ہوا تھا۔ کھاتے پیتے، ہنستے کھیلتے، افزائش نسل کرتے ہوئے ذی روح! تم میری موجودہ حالت پر فکر مند نہ ہو۔ یہ تو وقت نے کروٹ لی اور میری ہستی مٹ گئی ورنہ میرے بطن میں اشرف المخلوقات کی کئی نسلیں اچھلتی کودتی رہیں۔ میرے اندر یہ ویرانیاں ہمیشہ نہیں تھیں بلکہ انتہائی بُرے وقت کی بدولت مجھ پر نازل ہوئی ہیں۔''

''اوہ میں سمجھا! پھر یہ سب کیسے ہوا؟ یہ اجاڑ پن..... یہ ویرانی..... یہ تباہی....؟''

''بہت لمبی کہانی ہے۔ آدم کی کہانی سے مماثل۔ تخلیق سے تباہی تک کی داستاں۔ ناکردہ گناہوں کی سزا بھگت لی ہے میں نے۔ آدم نے تو ممنوعہ ثمر چکھ لیا تھا مگر میں نے ایسا کچھ بھی نہ کیا اور نہ ہی میرے یہاں مقیم کسی فرد نے کوئی نافرمانی کی۔ پھر بھی مجھے یہ بربادی جھیلنی پڑ رہی ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ انسان نے انسان کو جتنا پامال کیا ہے اتنا نہ آفات سماوی نے کیا ہے اور نہ ہی

آفات ارضی نے ۔ کبھی ایک دوسرے پر حکومت کرنے کی غرض سے، کبھی اس کو غلام بنانے کی خاطر، کبھی اس کی زمین و جائیداد ہڑپنے کے لیے، کبھی اس کے قدرتی وسائل پر قبضہ کرنے کے واسطے، کبھی اس کو مہذب بنانے کے چکّر میں اور کبھی اپنے مذہب کی اجارہ داری قائم کرنے کے لیے....!

مجھے یاد آرہا ہے کہ تقریباً ایک صدی قبل ایک متوسط خاندان کے سربراہ نے اپنا علیٰحدہ آشیانہ بنانے کا خواب دیکھا تھا....ایک ایسا آشیانہ جس میں اس کے بال بچے بے خوف و بے فکر اپنی زندگی بسر کرلیتے ۔ اس نے اپنی جمع پونجی کا حساب لگایا، اپنی شریکِ حیات کے زیورات بیچ ڈالے اور کچھ سرمایہ اپنے سسر سے حاصل کرلیا۔ ان دنوں بنک ہوتے تھے نہ فائنانس کمپنیاں ،ضرورت مند کو پورا سرمایہ خود ہی بندوبست کرنا پڑتا تھا۔ ساہوکار تو ہوتے تھے مگران کے چنگل میں پھنسنا خودکشی کے مترادف تھا۔ تاہم خوش آئند بات یہ تھی کہ مہنگائی اتنی نہ تھی۔ مکان تعمیر کرنے کے لیے بہت زیادہ سرمائے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ سربراہ نے زمین کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا خرید لیا اور اس پر اپنے لیے آشیانہ تعمیر کرنے لگا۔ ماہرِ فنِ تعمیرات نہ ٹھیکیدار، سیمنٹ نہ سریا، بس بڑھئی، راج اور مزدور، لکڑی، پتھر، اینٹیں اور مٹی ۔ پتھر پر پتھر رکھے گئے، اینٹوں پر اینٹیں رکھی گئیں، کمروں کو ہوادار بنانے کے لیے دیوار کی کھڑکیاں اور دروازے لگائے گئے، پھر دیواروں پر بھوسی مِلی پیلی مٹی کا پلستر چڑھایا گیا اور آخر کار ان کو قابل دید بنانے کے لیے ان پر پوتا پھیرا گیا۔ جستہ جستہ میں نے شونیہ سے نمودار ہوکر مکان کی صورت اختیار کرلی۔

مکان ....! ہاں صرف مکان....! وہ بھی تین منزلہ ...! ابھی گھر بننے میں کافی دیر تھی۔ چار دیواری کھڑی ہونے سے مکان تو بنتا ہے مگر گھر نہیں بنتا۔ گھر بنتا ہے مکینوں سے.... ہنستے کھیلتے، لڑتے جھگڑتے، دکھ سکھ بانٹتے ساکنین سے۔ میں ان کی آمد کا بے صبری سے انتظار کررہا تھا۔ مکان کے گھر میں تقلیب ہونے میں کئی مہینے لگ گئے ۔ رسوئی تھی ، بیٹھک تھی ، چھ کمرے تھے، ایک بالکونی تھی اور ان کے اوپر کڑیوں اور تختوں سے بنا ہوا ایک چھت تھا۔ چھت پر بھوج پتر اور مٹی کی

ایک موٹی سی پرت بچھا دی گئی تھی تا کہ مکین برف اور بارش سے بچ سکیں ۔ ان دنوں سی جی آئی چادریں دستیاب نہیں تھیں ۔ پہاڑی علاقہ تھا اس لیے کھپریل کا رواج بھی نہ تھا البتہ امیروں کے بنگلوں پر شنگل بچھانے کا رواج تھا۔

قریب چھ مہینے گزر جانے کے بعد بیس لوگوں پر مشتمل ایک بڑے کنبے نے میرے یہاں ڈیرہ ڈال دیا۔ صاحب مکان، اس کی اہلیہ اور ان کے بال بچے، صاحب مکان کے دو بھائی، بھاوجیں اور ان کی اولادیں ۔ میں خوشی سے پھولے نہیں سمارہا تھا جیسے کسی نے میرے اندر روح پھونک دی ہو۔ سب مل جل کر رہتے تھے۔ گھر کی عورتیں جھاڑو بہارو، لپائی پتائی کے علاوہ اناج اور مصالحہ کوٹتیں، موسم سرما کے لیے لال مرچیں اور سبزیاں سکھاتیں اور فرصت میں بال بچوں کے لیے گرم سویٹر بُن لیتیں۔ بیس افراد کے لیے روزانہ ناشتہ اور کھانا بنانا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ دن کب شروع ہوتا تھا اور کب ختم ہوتا تھا، پتا ہی نہیں چلتا تھا۔ بوڑھے بزرگ صبح سویرے اٹھ کر دور پہاڑی پر واقع دیوی کے مندر میں روزانہ حاضری دیتے ۔ نہ سینما تھا، نہ ٹیلی ویژن تھا اور نہ ہی کوئی اور تفریح کا سامان۔ کبھی کبھار کسی کی شادی بیاہ کی تقریب ہوتی تو 'بچہ نغمہ' کا انتظام کیا جاتا۔ نتیجے میں اکثر شرکت کرنے والے رات بھر جاگتے اور موسیقی و مقامی ناچ گانے سے لطف اندوز ہوتے ۔تنہائی، اکیلا پن، بوریت، یہ سب الفاظ ان دنوں لغت میں شامل نہیں تھے۔

کئی نسلوں نے میرے یہاں جنم لیا۔ ڈولیاں سجیں، ارتھیاں اٹھیں، کبھی شادیانے ہوتے رہے اور کبھی ماتم داریاں ہوتی رہیں۔ زندگی کا سلسلہ یوں ہی چلتا رہا، کبھی خوشی اور کبھی غم ۔ میں بھی ان کے ساتھ شادیوں میں شریک ہوتا رہا، مجھے خوب سجایا جاتا، میری ہر دیوار سے شادمانی ٹپکتی لیکن جب گھر میں ماتم چھا جاتا تو میں سوگوار ہو جاتا۔ میری ہر اینٹ، ہر پتھر مکینوں کے دکھ درد میں شریک ہو جاتا۔ تاہم وقت کے ساتھ ساتھ میرے مکینوں کی تعداد کم ہوتی گئی۔ ایک جانب خاندانی منصوبہ بندی پر سختی سے عمل ہونے لگا اور اکا دکا اولاد پر قناعت کی جانے لگی اور دوسری جانب لڑکیاں بالغ ہو کر سسرال کی نذر ہونے لگیں۔ اس پر طرّہ یہ کہ مکان میں کئی رہنے والوں نے اتنی ترقی کی کہ

انھیں اب یہاں رہنا اپنے رتبے سے کم تر محسوس ہورہا تھا۔ اس لیے وہ دوسری پوش کالونیوں میں جا کر بس گئے۔ دراصل بڑا بھائی ہونے کے ناتے صاحب مکان نے بھائی بہنوں کی دیکھ ریکھ میں ساری زندگی بسر کی اور اپنی فیملی کو نظر انداز کر دیا۔ گھونسلے میں جتنے بھی پرندے تھے وہ سب ایک ایک کر کے اپنے پروں کی قوت پرواز کا احساس ہوتے ہی پُھر سے اڑ گئے۔ باقی رہا صاحب مکان کا بیٹا، اس کا کنبہ کبھی متوسط درجے سے اوپر نہیں اٹھ پایا۔ اس بے چارے کی زندگی تو چھوٹی موٹی سرکاری نوکری کرتے کرتے گزر گئی اور اس کے بعد اس کا بیٹا نیا صاحب خانہ بن گیا۔ اس کے ساتھ اس کی شریک حیات اور تین غیر شادی شدہ اولادیں - دو لڑکیاں اور ایک لڑکا - رہتے تھے۔

پھر ایک روز انسانی آفت نے وادی میں تباہی مچادی۔ رات بھر گھر کے مکین کچھ کُھسر پُھسر کرتے رہے۔ سبھی افراد اپنا اپنا سامان پیک کرنے میں جُٹ گئے اور پو پھٹنے سے پہلے ہی سومو گاڑی میں بیٹھ کر نہ جانے کس سمت روانہ ہو گئے۔ انھیں یقین تھا کہ یہ نقل مکانی عارضی ہے اور وہ کچھ عرصے کے بعد لوٹ آئیں گے۔ مجھے نہ جانے کیوں ان پر ترس بھی آرہا تھا اور ہمدردی بھی ہو رہی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ ان سے کہہ دوں۔ ''بھئی ایک بار جو اپنا مسکن چھوڑ کر جاتا ہے وہ پھر کبھی واپس نہیں آتا۔ جڑوں سے اکھڑا ہوا پودا پھر اپنی دھرتی پر نہیں پنپتا۔'' مگر وہ میری بات کیسے سمجھ پاتے۔ اس کے بعد میں سوچتا رہا کہ نہ جانے وہ لوگ کس طرف گئے ہوں گے؟ اندر سے آواز آئی کہ وادی سے باہر جانے کا ایک ہی تو راستہ ہے۔ ساری برادری بانہال کے راستے جموں کی جانب روانہ ہوگئی، اس لیے وہ بھی اسی قافلے میں شامل ہوئے ہوں گے۔

وہ وقت ہی کچھ عجیب سا تھا۔ ہوا میں فرقہ واریت کا زہر پھیل چکا تھا۔ صدیوں کا باہمی اشتراک تاش کے پتوں کی طرح ڈھہ گیا تھا۔ انسان کو انسان پر بھروسہ کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ عسکری ماحول میں صرف اقلیت ہی نہیں بلکہ اکثریت کے بہت سارے لوگ خود کو غیر محفوظ محسوس کرنے لگے تھے۔ مقامی اخباروں میں روزانہ ان کے توضیحی بیانات آتے تھے کہ وہ انتظامیہ یا فوج کے کسی بھی شعبے کے ساتھ رابطہ نہیں رکھتے ہیں اور نہ ہی مخبری میں ملوث ہیں۔ ان میں سے کچھ مارے گئے

اور کچھ چھوٹ گئے۔ سرمایہ داروں نے تاوان کے طور پر زرِنقد دے کر جان چھڑائی مگر جستہ جستہ اپنا بزنس دیگر ملکی و غیر ملکی مقاموں پر شفٹ کرلیا۔ میرے مکینوں کے پاس فرار کا راستہ اختیار کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔

اس روز مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے اندر سے روح غائب ہوگئی۔ اب نہ روزمرہ کی چہچہاہٹ سننے کو ملتی تھی اور نہ ہی انسانی سانسوں کا زیروبم۔ وہ لوگ صدر دروازے پر تالا لگا کر چلے گئے، ضروریات زندگی کی چھوٹی موٹی چیزیں اپنے ساتھ لے گئے لیکن باقی سارا مال و متاع یہیں چھوڑ گئے۔ کچھ سامان وقت کے ساتھ سڑ گل گیا اور کچھ چوروں کی نذر ہوگیا۔ جان بچی لاکھوں پائے۔ تب سے اکتیس سال بیت چکے ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ ان کے آنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ پھر بھی میں ان کے لوٹنے کا انتظار کررہا ہوں۔ گو ابھی تک کسی نے مڑ کر بھی نہیں دیکھا مگر میری امید ابھی ٹوٹی نہیں ہے۔ شاید میرا مالک بھی امید لگائے بیٹھا ہوگا ورنہ میں نے سنا ہے کہ بیشتر مہاجرین نے اپنی جائیدادیں بیچ ڈالی ہیں اور ملک کے دوسرے علاقوں میں بس چکے ہیں۔

اس فرقہ وارانہ سونامی نے مجھے بے یار و مددگار چھوڑ دیا۔ میں بھوت بنگلہ بن کر رہ گیا ہوں۔ جہاں دیکھو جالے ہی جالے۔ ہوں گے کیوں نہیں، گذشتہ اکتیس برسوں میں کسی نے جھاڑو تک نہیں پھیرا، لپائی پتائی کی تو بات ہی نہیں۔ چھت کے نیچے چمگادڑوں نے اپنے گھونسلے بنائے ہیں اور اب وہی میرے مکین بن چکے ہیں۔ جگہ جگہ سے اینٹیں اکھڑ گئی ہیں، مٹی کا پلستر بھر بھرایا ہے، اکثر جگہوں سے چھِل چکا ہے اور اس کے نیچے سے اینٹیں دکھائی دے رہی ہیں۔

وہ جو ۸/ اکتوبر ۲۰۰۵ء کو زلزلہ آیا تھا گو اس نے سرحد پار کشمیر کو تباہ کردیا مگر سرحد کی اس طرف بھی کئی مقامات پر بستیاں اجڑ گئیں۔ جھٹکوں کے سبب میں بھی جھولتا رہا اور میری چولیں بھی ہل کر رہ گئیں۔ چھت کی چند ایک کڑیاں ٹوٹ کر لٹک گئیں۔ چار دیواری میں کہیں کہیں شگاف پیدا ہوگئے۔ کوئی واویلا کرنے والا تھا نہ کوئی مرمت کرنے والا۔ میں دم بخود دیکھتا رہا اور برداشت کرتا رہا۔

کئی بار اپنی بد حالی پر ترس آتا ہے۔ جس کی روح میں ویرانی چھا گئی ہو اسے سب کچھ ویران سا لگتا ہے۔ یہی حال میرا بھی ہے۔ مجھے اپنا آپ تنہا اور بے آسرا محسوس ہو رہا ہے۔ خالی خالی سا....! میرا وجود لمحہ لمحہ پراگندہ ہوتا جا رہا ہے۔

جیسے اتنا کچھ کافی نہ تھا، وادی میں ستمبر ۲۰۱۴ء کو ایسا تباہ کن سیلاب آیا جس کی ماضی میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ جہاں دیکھو وہاں پانی ہی پانی۔ انسان نوالوں کو ترسنے لگا۔ میرے اندر بھی پانی کا ریلا آیا اور کئی دنوں تک واپس بہنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ خیر جب بہہ نکلا تو اپنے پیچھے تعفن ہی تعفن چھوڑ گیا۔ پانی کے رِساؤ نے میری بنیاد کو متاثر کر دیا۔ اس وقت بھی مجھے سنبھالنے والا کوئی موجود نہ تھا۔ سنبھالتا کون، صاحب مکان تو دنیا کی بھیڑ میں کہیں کھو گیا تھا۔ سنا ہے نگروٹا میں کسی ٹینٹ میں رہتا تھا اور گورنمنٹ نے اس کو نزدیک ہی ایک کمرے کا کوارٹر الاٹ کیا ہے۔ میاں بیوی اب وہیں رہتے ہیں۔ دونوں بیٹیاں بیاہی جا چکی ہیں اور اپنی سسرال میں رہتی ہیں۔ ایک نے پنجابی اروڑہ لڑکے سے شادی کر لی ہے اور دوسری نے یوپی کے اگروال خاندان میں۔ وہاں سسرال میں کوئی کشمیری زبان نہیں بولتا۔ لڑکیوں نے پنجابی اور ہندی سیکھ لی ہے اور اپنے بچوں کے ساتھ انہی زبانوں میں بات کرتی ہیں۔ غرض انھیں اپنے رسم و رواج اور زبان ترک کرنا پڑے اور اجنبی کلچر کو گلے لگانا پڑا۔ لڑکا تو ایم بی اے کر کے امریکا چلا گیا اور وہیں پر ایک ہسپانوی لڑکی کو دل دے بیٹھا۔ ان کے بچے بھی کشمیری نہیں بولتے۔

سب اپنی پہچان کھو بیٹھے ہیں۔ زبان بھول چکے ہیں۔ اپنے رسم و رواج سے نا آشنا ہیں۔ نہ کشمیری لباس پہنتے ہیں، نہ پھرن اور کانگڑی استعمال کرتے ہیں، نہ جنم دن پر تہری بناتے ہیں اور نہ اپنے مخصوص تیوہار مناتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ انھوں نے نہ صرف اپنی دھرتی کھوئی ہے بلکہ اپنی جڑیں بھی کھوئی ہیں۔ وہ اپنی تہذیب، تمدن اور ثقافت سے محروم ہو چکے ہیں۔

جموں میں بوڑھا اور بڑھیا اکیلے پڑ گئے ہیں۔ معاشی طور پر بہت آسودہ حال ہیں مگر پھر بھی ان کو اپنی زندگی میں کچھ کمی سی محسوس ہو رہی ہے۔ اس عمر میں بھی مجھے بہت یاد کرتے ہیں۔ یہی

تو یادوں کا اثاثہ بچا ہوا ہے ان کے پاس۔ میں بھی انھیں بہت یاد کرتا ہوں۔

کچھ مہینے پہلے ان کا بیٹا اپنی ہسپانوی بیوی کو لے کر کشمیر سیر و سیاحت کے لیے آیا تھا۔ دونوں مجھے دیکھنے کے تمنائی تھے۔ ٹیکسی سے اترے اور سڑک کے اس پار میرے روبرو کھڑے ہو گئے۔ پھر دونوں نے میری جانب پیٹھ کر کے ایک سیلفی اتاری اور دوسرے روز فیس بک اور ٹویٹر پر ڈال دی۔

فوٹو کے نیچے لکھا تھا۔ 'ہمارا اجڑا ہوا آشیانہ'۔

والدین نے جونہی تصویر دیکھ لی ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا بہہ نکلا۔ میرے ساتھ ان کی بے شمار ناستلجیائی یادیں جڑی ہیں۔ وہ بار بار میری تصویر کو دیکھتے رہے۔ وہ تصویر دیکھنے میں اتنے کھو گئے کہ ان کو کسی اور کی موجودگی کا احساس ہی نہیں ہوا۔ بہت دیر بعد ان کی نظر اپنے بیٹے اور بہو پر پڑی جو تصویر کے پیش منظر میں کھڑے تھے۔

وہ دُکھ بھرا دن

امتحان ہال میں وہ سوالات پر نظر دوڑا رہی تھی۔ اردو زبان کا امتحان تھا اور مضمون لکھنا ضروری تھا۔ کئی موضوعات دیے گئے تھے مگر ایک موضوع نے اسے چونکا دیا۔ 'میری زندگی کا سب سے المناک دن'۔

وہ سوچ میں پڑ گئی۔ اس کو وہ دن یاد آیا جب وہ زندگی سے پوری طرح مایوس ہو چکی تھی۔ ہر طرف تاریکی ہی تاریکی نظر آ رہی تھی۔ کہیں سے کوئی امید کی کرن دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ ہمت کر کے اس نے قلم کو جنبش دی اور اپنی زندگی میں گزرا حقیقی حادثہ رقم کرنے لگی۔

اکلوتی بیٹی ہونے کے باوجود والدین نے مجھے مسوری انٹرنیشنل اسکول میں داخلہ کروایا تا کہ میری تعلیم میں کہیں کوئی کمی نہ رہ جائے۔ لڑکیوں کا بورڈنگ اسکول تھا اور ہوسٹل کے انتظامات بہت اچھے تھے۔ میرے والدین دہلی میں نوکری کرتے تھے۔ دن رات محنت کرتے، خود روکھی سوکھی کھاتے مگر ہر دم یہی خواب دیکھتے کہ ہماری بیٹی بہت بڑی سِوِل سرونٹ یا بزنس مینیجر بن جائے۔ اب آپ میرا نام بھی پوچھیں گے۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ کو میرا نام جاننے کا تجسس ہوگا۔ اس لیے اپنا نام بتلاتی چلوں۔ میرا نام ہے شفالی سنہا۔ پتا جی بنک میں ملازم ہیں اور ماں ایک پبلک اسکول میں پی جی ٹی ہیں یعنی پوسٹ گریجویٹ ٹیچر۔

سچ تو یہ ہے کہ متوسط طبقے کے لوگ روشن مستقبل کے لیے اپنا حال گروی رکھتے ہیں۔ ایک جانب مجھے ہوسٹل میں والدین کا پیار نہیں ملتا تھا اور دوسری جانب انھیں بیٹی کا سکھ نہیں ملتا تھا۔

اس پر طرّہ یہ کہ ایک ہی بچے کے بعد انھوں نے خاندانی منصوبہ بندی کی تھی۔ کرتے بھی کیا، آج کل بچوں کی تعلیم صرف سرمائے کا کھیل بن چکا ہے۔ سال میں انھیں دو چار روز کی چھٹی مل جاتی تو فوراً مجھ سے ملنے چلے آتے یا پھر جب کرسمس یا پوجا کی چھٹیاں ہوتیں تو میں ہی جھٹ پٹ گھر پہنچ جاتی۔ ان دنوں ان سے پورے سال کا پیار وصول کرنے کی کوشش کرتی۔

مجھے یاد ہے کہ جب میں آٹھویں جماعت میں پڑھتی تھی میرے والدین نے ایل ٹی سی لے کر کولکتہ گھومنے کا پروگرام بنالیا۔ مجھے بھی لے کر جانا چاہتے تھے مگر میں نے منع کرلیا کیونکہ میں اپنی کلاسز ناغہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ان کی مجبوری یہ تھی کہ گذشتہ بلاک کی ایل ٹی سی کی میعاد ختم ہونے والی تھی اور اگر وہ نہ جاتے تو یہ سہولت بعد میں نہیں مل سکتی تھی۔ سو وہ مجھ سے ملنے مسوری چلے آئے اور پھر ڈیرہ دون سے ریل گاڑی میں کولکتہ چلے گئے۔ واپسی بذریعہ ہوائی جہاز مقرر تھی جس کے لیے انھیں کچھ رقم اپنی جیب سے خرچ کرنی پڑی۔ کولکتہ سے وہ مجھ سے ٹیلی فون پر باتیں کرتے اور وہاں کے مندروں، تاریخی عمارتوں، ثقافتی اداروں اور رسم ورواج کے بارے میں آگاہ کرتے۔ ہفتہ بھر کولکتہ میں ان کا قیام رہا۔

۲۰ نومبر کو انھیں واپس دہلی پہنچنا تھا۔ اسی روز ٹیلی ویژن پر خبر آئی کہ کولکتہ سے آرہا ہوائی جہاز راستے میں ہائی جیک کرلیا گیا ہے۔ میں دل ہی دل میں دعا کرنے لگی کہ اس فلائٹ میں میرے والدین نہ ہوں۔ لیکن جلدی ہی اپنی خود غرضی اور حماقت پر ندامت ہوئی۔ سوچنے لگی اگر میرے والدین نہیں ہوں گے کسی اور کے تو ہوں گے۔ تخریب تو تخریب ہے۔ نہ جانے ان انسان نما درندوں کو ایسی حرکتیں کرنے سے کیا ملتا ہے۔ میں بہت پریشان ہوئی۔ ہوسٹل وارڈن سے بات کرلی اور اس نے دن بھر ٹیلی ویژن چالو رکھنے کی اجازت دی۔ سوچ رہی تھی کہ کہیں سے کوئی خبر مل جائے کہ ہوائی جہاز پر کون لوگ سوار تھے۔ اِدھر عجیب سے ڈراونے سپنے آرہے تھے۔ میرے ذہن پر والدین کے اُداس اور لاچار چہرے بار بار ابھر رہے تھے جو بانھیں کھولے مجھے پکار رہے تھے۔ میری آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب امڈ آیا اور میں خاموش ٹیلی ویژن کی ہر خبر دیکھتی رہی۔

ہوائی جہاز میں دوسو سے زائد مسافر سوار تھے۔ مجھے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ معصوم لوگوں کو یرغمال بنانے سے ان اغوا کرنے والوں کو کیا ملتا ہے؟ دل سے بددعائیں نکل رہی تھیں۔ انسان کی تخریبی کارروائیوں پر تعجب ہو رہا تھا۔ خود کو اشرف المخلوقات کہنے والا انسان جب تخریب پر اُتر آتا ہے تو حیوانیت کی ساری حدیں پار کر جاتا ہے۔

کولکتہ سے دہلی کا سفر ڈھائی گھنٹے کا تھا۔ سفر کے دوران ہوائی جہاز میں تین آدمی کھڑے ہوئے، انھوں نے اپنے پستول نکالے اور ائیر ہوسٹس کو یرغمال بنا کر کاک پٹ میں داخلہ حاصل کرلیا۔ وہاں انھوں نے پائیلٹ کو جہاز دہلی کے بدلے لاہور لے جانے کا حکم دیا۔

ٹیلی ویژن پر مسلسل اَپ ڈیٹ آرہے تھے۔ طیارے نے اپنا روٹ بدل لیا اور لاہور کی طرف اڑان بھرلی۔

میرے لیے تو ہر لمحہ اذیت ناک بنتا جا رہا تھا۔ والدین کے بارے میں کہیں سے کوئی خبر نہیں مل رہی تھی۔ ان کا موبائل بھی سوئچ آف آرہا تھا۔ کولکتہ میں کسی سے جانکاری نہیں تھی جس سے رابطہ کیا جاتا۔ وارڈن نے بہت کوشش کی کہ انڈین ائیر لائنز سے رابطہ کرلے مگر ناکام رہی۔ وہاں کے سبھی ٹیلی فون مصروف مل رہے تھے۔

میں مسلسل ٹیلی ویژن کی تازہ خبریں دیکھ رہی تھی اور اس انتظار میں تھی کہ کب وہ مسافروں کے نام بتادیں۔ تین گھنٹے اسی تذبذب میں گزر گئے۔ میری آنکھوں کے سامنے ہر سو تاریکی پھیل چکی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ میں اپنے والدین کا منہ دوبارہ نہیں دیکھ پاؤں گی۔ عجیب سے ڈراونے خیالات ذہن میں پیدا ہورہے تھے۔ اگر میرے والدین واپس نہ آئے تو میرا کیا ہوگا؟ میں یتیم ہو جاؤں گی۔ میری تعلیم بند ہو جائے گی۔ اور پھر میرے ماں باپ کے سپنے سب دھرے کے دھرے رہ جائیں گے۔ کتنی بے ثبات ہے یہ زندگی! مڈل کلاس سوسائٹی کی یہی دشواریاں ہیں۔ ایک معمولی سی کروٹ سے تلپٹ ہو جاتی ہے۔ میں تو کہیں کی نہ رہ جاؤں گی۔

سہیلیاں میرے آگے پیچھے جمع ہوتی چلی گئیں اور مجھے دلاسہ دیتی رہیں۔

''شفالی، مجھے معلوم ہے کہ اس وقت تم پر کیا گزر رہی ہوگی۔ مگر میری ریکوئسٹ ہے کہ بی پوزٹیو۔ منفی خیالات کو ذہن سے نکال دو۔ تمھارے ماتا پتا صحیح سلامت ہوں گے اور جلدی گھر واپس آئیں گے۔''

''شفالی، ہم اس دکھ کی گھڑی میں تمھارے ساتھ ہیں اور بھگوان سے پرارتھنا کرتے ہیں کہ تمھارے والدین بھلے چنگے واپس گھر پہنچ جائیں۔''

میں ان کی باتوں پر دھیان نہیں دے رہی تھی۔ اپنے ہی خیالوں میں گُم تھی۔ دوپہر سے پہلے ہی ایسی منحوس خبر سننے کو ملی تھی۔ لنچ کیا کرتی ایک نوالہ بھی گلے سے نیچے نہیں اتر رہا تھا۔ بھوک غائب ہوگئی تھی۔ لاکھ کوشش کرنے کے باوجود آنسو روکنے سے بھی نہیں رک رہے تھے۔

نہ جانے ڈیڈی کس حال میں ہوں گے؟ وہ تو کبھی کسی کا بُرا نہیں چاہتے ہیں پھر ان پر یہ مصیبت کیوں آن پڑی؟

ممی بے چاری کا تو دل کمزور ہے۔ نہ جانے کیا بیت رہی ہوگی اس پر۔

بار بار دعا کرتی کہ وہ اس فلائٹ میں نہ ہوں۔

پھر خبر آئی کہ طیارہ تیل بھرنے کے لیے امرتسر میں اتارا گیا۔ اغوا کرنے والوں نے بہت کوشش کی کہ وہ امرتسر میں نہ اترے مگر پائیلٹ نے اپنا فیول گیج دکھا کر انہیں بتایا کہ طیارہ آگے اور نہیں بڑھ سکتا ہے۔ سرکار کی طرف سے بہت کوشش کی گئی کہ ہائی جیکروں کو کسی طرح بہلایا پھسلایا جائے اور یرغمال شدہ لوگوں کو آزاد کرایا جائے۔ مگر اغوا کرنے والے تو کچھ بھی ماننے کو تیار نہ تھے اور کسی بھی کارروائی پر طیارے کو بم سے اڑانے کی دھمکی دے رہے تھے۔

ٹیلی ویژن پر تازہ خبریں مسلسل دکھائی جارہی تھیں۔ کوئی نیوز ریڈر کہہ رہا تھا۔ ''امرتسر کے ائیر پورٹ پر ہوائی جہاز اترا ہوا ہے، اس کو فوج نے گھیر لیا ہے مگر کوئی آگے بڑھنے کی جرأت نہیں کر رہا ہے۔''

اس طرح دن کا ڈیڑھ بج گیا۔

پھر دو بج گئے۔

اور پھر تین بج گئے۔

دریں اثنا اغوا کرنے والوں نے وائرلیس پر خبر دی کہ ہوائی جہاز کو اسی صورت میں آزاد کیا جائے گا جب تین چنندہ دہشت گردوں کو حفاظت کے ساتھ ہمارے حوالے کیا جائے گا اور ہمیں اپنی مرضی سے جانے کی اجازت دی جائے گی۔

متعلقہ افسروں نے ہوم منسٹری سے رابطہ کیا اور ان کو اغوا کرنے والوں کے مطالبات سے آگاہ کرلیا۔

سرکار مجبور تھی۔ ایک طرف تین دہشت گرد تھے اور دوسری طرف دوسو سے زائد مسافر اور ہوائی جہاز کا عملہ۔ سرکار نے ان کی یہ مانگ مان لی مگر مخصوص دہشت گردوں کو لے کر آنے میں تو وقت درکار تھا۔ جو کچھ بھی ہوتا دوسرے دن ہی ممکن تھا۔

انجام کار رات بھر معاملہ یوں ہی لٹکا رہا۔ مسافر رات بھر ہوائی جہاز میں قید رہے۔ بچے، نوجوان، بوڑھے، مرد، عورتیں.... سبھی رات بھر جاگتے رہے اور اپنے مستقبل کے لیے فکرمند رہے۔ شکر تھا کہ کوئی انہونی نہیں ہوئی۔

کہیں سے کوئی خبر نہیں مل رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ گھڑی کی سوئیاں ایک ہی جگہ تھم گئی ہیں۔ ٹیلی ویژن پر وہی باسی خبریں پروسی جارہی تھیں۔ جی میں آیا کہ ٹیلی ویژن ہی توڑ دوں۔ میرے والدین یرغمال ہو چکے تھے مگر ٹیلی ویژن والے ہوائی جہاز کے اردگرد کے مناظر دکھارہے تھے۔

بیچ بیچ میں ہائی جیکروں کو یوں لگا کہ ان کی مانگوں پر کوئی کارروائی نہیں ہورہی ہے، انھوں نے ایک ایک کر کے پسنجروں کو مارنے کی دھمکی دی۔ مگر انھیں دلاسہ دیا گیا کہ ان کے لیے معقول انتظامات کیے جارہے ہیں۔ ایک الگ جہاز جس میں وہ تینوں دہشت گردوں سمیت سرحد پار کر سکتے ہیں۔

اور پھر دوسرے روز ایسا ہی ہوا۔قریب بارہ بجے ایک اور طیارے کا انتظام کیا گیا، جس میں تینوں مطلوبہ دہشت گرد تھے، وہ امرتسر ایئر پورٹ پر اترا، ہائی جیکروں کو بھی اسی طیارے میں منتقل کیا گیا اور وہ طیارہ ان کی منشا کے مطابق لاہور کے بدلے براہ راست کابل کے لیے روانہ کر دیا گیا۔

مسافر بے تحاشہ ہوائی جہاز سے باہر آنے لگے گویا قید خانے سے قیدی چھوٹ گئے ہوں۔انھیں یقین ہی نہیں ہو رہا تھا کہ وہ زندہ ہیں اور آزادی سے اپنے ملک میں سانس لے رہے ہیں۔کچھ دیر بعد ٹیلی ویژن پر مسافروں کے نام بتائے گئے۔پتاجی اور ممی کا نام بھی ان میں شامل تھا۔

مجھے اطمینان ہوا کہ میرے والدین زندہ ہیں، اس کے باوجود بے کلی و بے چینی بدستور محسوس ہو رہی تھی۔میں ان کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتی تھی، ان سے باتیں کرنا چاہتی تھی، اپنی ماں کا ممتا بھرا لمس محسوس کرنا چاہتی تھی۔رات کے وقت ٹیلی فون پر دونوں سے بات ہوئی، پھر بھی تسلی نہ ہوئی۔دوسرے روز علی الصباح میں دہلی کے لیے روانہ ہوگئی۔

گھر کے دروازے پر ماں باپ دونوں کو منتظر پایا۔انھوں نے مجھے بھینچ کر گلے لگایا اور زار و قطار رونے لگے۔مجھے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ میں انھیں دیکھ رہی ہوں۔

مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ موت کا سامنا کرنے کے بعد ہی زندگی کی قدر و قیمت سمجھ میں آتی ہے۔میرے ماتا پتا نے دوسرا جنم لیا تھا۔انھیں پا کر مجھے ایسا لگا کہ ساری دنیا کی دولت پائی ہے۔

آج بھی جب کبھی مجھے اس المناک دن کی یاد آتی ہے تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

کالے حروف کا ساحر

اس کے قلم سے جو کچھ بھی نکلتا تھا وہ پڑھنے والوں کو سحر زدہ کرتا۔ ابتدا میں وہ پھوک پھوک کر قدم اٹھاتا تھا۔ بہت سوچ سمجھ کر اس کے قلم کی سیاہی کالے حروف میں بدل کر قارئین کی تشنگی مٹاتی جیسے منہ کھولے سیپ میں برسات کی بوندیں گر کر موتیوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ حروف اس کی سوچ کا حصہ بن گئے اور اس کے خیالات کے ساتھ گھل مل گئے۔ اب وہ خود بخود قرطاس پر موتیوں کی طرح بکھر جاتے۔ لوگ اس کی تحریروں کا بے صبری سے انتظار کرتے۔ دوشیزائیں اس کے افسانے اور ناول پڑھتے پڑھتے نیند کی آغوش میں سما جاتیں اور جب صبح جاگ اٹھتیں تو سرہانے پڑی کتاب دیکھ کر مسکرا دیتیں۔

آخر ایسا کیا تھا جس کے سبب مہیش چندر کو اتنی مقبولیت حاصل ہوئی جس کا ثانی ملنا مشکل ہے۔ ابھی مارکیٹ میں اس کی کتاب آ ہی چکی ہوتی کہ لوگ دوسری تخلیق کا انتظار کرتے۔ اس کے ہر لفظ میں جادو تھا۔ ہر ترکیب میں دلکشی تھی۔ کہانیوں کے پلاٹ ایسے بُن لیتا کہ ساری کہانی میں رومانیت کی فضا پیدا ہوتی۔ اس کے اکثر کردار غریب، مفلس اور ستم زدہ ہوتے جن کے چہروں پر معصومیت اور آزادروی کی جھلک صاف دکھائی دیتی۔ وہ کھلی فضاؤں میں سانس لینا چاہتے تھے ،اپنی زندگی کی کڑواہٹوں کو بھول جانا چاہتے تھے اور گریزاں لمحوں سے لطف اندوز ہونا چاہتے تھے۔ اس رومانیت کی ایک وجہ اور بھی تھی اور وہ یہ کہ اس نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ ہمالیہ کی فرحت بخش وادیوں میں گزارا تھا جہاں کی ہواؤں میں عشق کی مہک بسی تھی، جہاں کے مرغزاروں میں رنگ

برنگے پھولوں کے تختے انسانی جذبات کو انگیز کرتے تھے، جہاں ناگن کی طرح بل کھاتی ندیوں کی سریلی آواز محبت کی راگنی چھیڑتی تھی، جہاں صبح وشام جھٹ پٹے کے وقت پرندوں کے نغمے فضا میں لہرا کر انسان کا دل موہ لیتے تھے اور جہاں برف سے ڈھکے اودے اودے پہاڑوں میں انسان اپنے وجود کو تلاشنے میں گُم ہو جاتا تھا۔ ایسے ماحول میں رہ کر بھلا ایک حساس آدمی فن کار نہ بنتا تو پھر کیا بنتا۔ عام طور پر ایسے ماحول میں دل میں ترنگیں اٹھتی ہیں اور انسان کے جذبات بے قابو ہو جاتے ہیں۔ وہ اشعار کی شکل اختیار کرنے کے لیے بے تاب ہوتے ہیں مگر مہیش چندر کی طبیعت شاعری کے لیے موزوں نہ تھی۔ وہ نثر کے لیے بنا تھا اور نثر میں ہی شاعری کر لیتا تھا۔ اچھا ہوا کہ اس نے شاعری کی جانب رخ نہیں کیا ورنہ ادب کو ایک بے نظیر افسانہ نگار سے ہاتھ دھونا پڑتا۔

اس کے والدین اسے ڈاکٹر یا انجینئر بنانا چاہتے تھے مگر اسے سائنس مضامین میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ماں کو جب احساس ہوا کہ اس کے بیٹے کا طبعی میلان سائنس کی طرف نہیں ہے تو اس نے چاہا کہ کم سے کم وکیل تو بن جائے تا کہ عزت سے اپنی روزی روٹی کما سکے۔ مگر مہیش چندر کے سر پر افسانے لکھنے کا بھوت سوار تھا اور اس بھوت کو اتارنا کسی اوجھے کے بس کی بات نہ تھی۔ پڑھائی ختم کرتے ہی وہ شہر شہر ملازمت ڈھونڈتا پھرا، کبھی صحافت اختیار کی اور کبھی ریڈیو میں کام کیا مگر دل کہیں نہ لگا۔ آخر کار فلم نگری ممبئی میں پناہ لی۔

حالانکہ تعلیم کے سلسلے میں اس نے روایت پسند ماں کی نہیں مانی مگر شادی کے معاملے میں وہ اس کا دل نہ دُکھا سکا۔ ماں نے اپنی سوجھ بوجھ سے ایک اچھی سی لڑکی پسند کی اور بیٹے سے اس کی رضامندی پوچھ لی۔ اُدھر بہن نے اپنی ہونے والی بھابی کو دیکھ لیا اور اپنی منظوری دے دی۔ پھر کیا تھا، مہیش چندر انکار نہ کر سکا۔ چند ہی دنوں میں ڈھول تاشے بجے، مہیش چندر سہرا باندھ کر گھوڑی چڑھ بیٹھا اور واپسی پر بچے پیدا کرنے والی ایک مشین کو اپنے ساتھ لے آیا۔ مہیش چندر نے اپنی زندگی کا سب سے بڑا فیصلہ کسی اور کے سپرد کر لیا جس کا پچھتاوا اسے عمر بھر رہا۔ وہ جب کبھی اس بارے میں سوچتا تو اپنے آپ کو دوشی قرار دیتا۔ مگر ہونی تو ہو کر رہ گئی اور چند برسوں ہی میں لیلا

وتی اس کے تین بچوں کی ماں بن گئی۔ اتنا تو ظاہر تھا کہ اسے نہ اپنی بیوی میں دلچسپی تھی اور نہ ہی اپنے بچوں میں۔ کون کس کلاس میں پڑھتا ہے، کون کب بیمار ہوا یا پھر کس کا لباس پھٹا ہوا ہے، ان سب چیزوں کے ساتھ اسے کوئی غرض نہیں تھی۔ وہ سب دہلی میں کفایت شعاری سے رہتے تھے جبکہ خود مہیش چندر ممبئی میں سکھ چین کی زندگی بسر کرتا۔ تاہم ہر مہینے ان کو کچھ روپے بھیج دیتا۔ کتنا کمایا، کتنا خرچ کیا اس کا کوئی حساب نہ تھا۔ دوست نواز تھا، کئی اجنبی اس کے گھر میں پلتے اور ممبئی میں سیٹل ہونے تک اس پر بوجھ بنے رہتے۔ عمدہ کپڑے پہنتا، عام طور پر سوٹ زیب تن کرتا اور باہر جانے سے پہلے اس پر عطر چھڑکتا۔ ٹیکسیوں پر جتنا خرچ کرتا اتنے میں ایک اچھی موٹر آجاتی مگر اسے کون سمجھاتا۔ وہ شاید پہلا اور واحد ادیب تھا جو اپنی تخلیقات کے بل بوتے پر جی رہا تھا۔ یہ بات الگ کہ فلموں میں بھی اسکرپٹ رائٹنگ اور مکالمہ نگاری سے کافی آمدنی ہو جاتی۔ حالانکہ فلم سازی اور ہدایت کاری میں اسے لینے کے دینے پڑ گئے۔

مہیش چندر نے نہ کبھی کسی مندر میں متھا ٹیکا اور نہ کسی سادھو سنت کے سامنے حاضری دی۔ بچپن ہی سے اس کا لگاؤ اشتراکیت کی جانب رہا۔ جن دنوں ایم اے (انگریزی ادب) کی تعلیم حاصل کر رہا تھا انھیں دنوں مارکس اور اینگلز کی کتابوں کا مطالعہ کرنے لگا۔ وہ انقلاب کا متمنی تھا۔ وہ ہندوستان میں بھی روس اور چین کی طرح لال رنگ کا پرچم لہرانا چاہتا تھا۔ اسے نہ خدا پر یقین تھا اور نہ کسی مذہبی کتاب پر۔ یہی مارکسی نظریہ اس کے افسانوں اور ناولوں پر حاوی رہا۔ وہ غریبوں، مفلسوں، مزدوروں اور کسانوں کی باتیں کرتا تھا۔ عورتوں پر ہو رہے استحصال کو اجاگر کرتا تھا۔ معصوم چہروں کو ظلم کی چکی میں پستے ہوئے درشاتا تھا۔ اس کا پیغام انسان دوستی تھا۔ وہ عالم میں امن و آشتی کا خواہاں تھا۔ اس نے بنگال کے قحط کے بارے میں لکھا۔ عالمی جنگوں کی خون ریزیوں کے بارے میں لکھا۔ ایٹم بم کی تباہ کاریوں کے بارے میں لکھا۔ وہ لکھتا رہا اور لوگوں کو سحر زدہ کرتا رہا۔ پڑھنے والے اس کے دیوانے ہوتے رہے۔ انھیں محسوس ہوتا کہ مہیش چندر نہ صرف ایک فکشن نگار ہے بلکہ انہی میں سے ایک فرد ہے جو ان کو کرداروں کے ذریعے دنیا کے سامنے پیش

کرتا ہے۔ وہ اس کی لمبی عمر کے لیے دعا کرتے اور اس کے قلم کی روانی کے لیے خدا کی بارگاہ میں التجا کرتے۔

مہیش چندر پر کئی دوشیزائیں مرمٹتی تھیں یا یوں کہیے کہ وہ ایک مقناطیس تھا جو دوشیزاؤں کو لوہے کی مانند اپنی طرف کھینچ لیتا تھا۔ ان کے ساتھ وہ غم غلط کر لیتا اور ٹائم پاس کر لیتا تھا۔ تاہم ایک دوشیزہ نے اس کا دل جیت لیا۔ شیریں خود بھی افسانہ نگار تھی اور بہت ہی اچھی اردو لکھتی تھی۔ وہ اس کی محبت میں ایسے گرفتار ہوا کہ اس کی دنیا صرف شیریں کے وجود تک سمٹ گئی اور شیریں کے بغیر اسے اور کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو محبت بھرے خط لکھتے اور اپنے دل کے سبھی بھید کھول دیتے یہاں تک کہ ان کے بیچ اب کوئی راز رہا ہی نہیں۔ شیریں مطلقہ عورت تھی جبکہ مہیش چندر کی ایک بیوی اور تین بچے تھے جن میں سے ایک بچہ خللِ دماغ کا شکار تھا۔ مہیش چندر، جو اپنے افسانوں میں عورت کی کسمپرسی، استحصال اور لاچاری کو موضوع بناتا تھا خود یہ بھول گیا کہ اس کی بھی ایک بیوی ہے جو اس کی محبت کے لیے تڑپ رہی ہے اور جس کی گود میں اس نے تین بچے رکھ چھوڑے ہیں۔ ایک روز ایک دوست نے اس کی توجہ اس جانب مبذول کرائی تو جواب ملا۔ ''یار کیا بتاؤں، وہ شادی میری پسند سے نہیں ہوئی تھی۔ ماں نے زبردستی کی، میں نے لڑکی بھی نہیں دیکھی، چھوٹی بہن نے دیکھ لی اور منظوری دے دی۔''

''ماں نے زبردستی کی، بہن نے منظوری دے دی اور تم راضی ہو گئے۔ شادی نہیں کوئی بچوں کا کھیل ہوا۔ جیسے تم نے تعلیم کے حوالے سے ماں کی ایک نہ مانی اسی طرح شادی کے بارے میں بھی انکار کر دینا تھا۔''

''یہی تو نہ کر سکا، اور آج تک بھگت رہا ہوں۔ اس عورت کے ساتھ کوئی دن بھی آسانی سے نہ گزر سکا۔ نہ وہ علمیت اور نہ ہی وہ شاعرانہ طبیعت۔ بات کرنے بیٹھو تو بس دال روٹی، بچوں کے کپڑے، سکول کی فیس اور رشتہ داروں کی توقعات کے علاوہ اس کے پاس اور کوئی موضوع نہیں ہوتا۔ سچ پوچھو تو میں نے کبھی اس کے ساتھ کھل کر بات ہی نہیں کی۔ کچھ عشق کی باتیں، کچھ تصوراتی

اڑائیں اور کچھ شعروشاعری۔''

''بہت خوب۔ تمہیں پہلے دن ہی سے احساس ہوا کہ یہ شادی بے جوڑ ہے۔ ہے ناں؟''

''ہاں یار۔ یہی سچ ہے۔''

''اوراس کے باوجود تم اس کے ساتھ سوتے رہے، اپنی جنسی پیاس بجھاتے رہے اوراس کی گود میں تین بچے رکھ دیے۔ ان میں سے ایک بچہ ذہنی خلل سے دوچار ہے اوراس کو دیکھ کر دل دہلتا ہے۔ مگر تمھیں ان باتوں سے کیا لینا دینا، تم کو تو جمالیاتی تسکین کی ضرورت ہے۔ ہے ناں؟''

''یار، شادی کے بعد مجھے سمجھ ہی نہیں آیا کہ میں کیا کروں۔ دن بھر کی تھکان کو بیوی کے جسم میں انڈیلتا رہا۔ شکل وصورت سے وہ کچھ کم پایہ نہ تھی مگر ذہنی طور پر مجھے کم تر محسوس ہوئی۔ میں نے بہت کوشش کی اس کے ساتھ نبھانے کی مگر ناکام رہا۔''

''ناکام رہے یا اس کا نعم البدل ڈھونڈ لیا۔ ایک جسمانی تشنگی مٹاتی رہی اور دوسری ذہنی تسکین فراہم کرتی رہی۔''

''تم کچھ بھی سمجھو، میرے لیے تو وہ قصہٴ پارینہ ہے۔''

شیریں سے مہیش چندر کی شادی ٹیڑھی کھیر ثابت ہوئی۔ شیریں کے والدین اس شادی کے خلاف تھے کیونکہ مہیش چندر کا مذہب ان سے مختلف تھا۔ شیریں نے مہیش کو اس پرابلم کی طرف دھیان دلایا مگر مہیش نے اس کا بھی حل ڈھونڈ نکالا۔ یہ سچ تھا کہ وہ پیدائشی طور دوسرے مذہب سے تعلق رکھتا تھا مگر بذاتہ وہ ملحد تھا اوراس کے لیے مذہب کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔ اس لیے اس نے اپنا مذہب بدلنے کے لیے ہاں کردی۔ اس طرح اس نے ایک تیر سے دوشکار کیے۔ ایک طرف شیریں خوش اور دوسری طرف قانوناً وہ اپنے مذہب سے بری ہوگیا جس میں طلاق کے بغیر شادی کرنا جرم مانا جاتا ہے۔ شادی کے لیے اس نے ایک پہاڑی مقام پر پناہ لی جہاں پر کچھ دوستوں نے سارا انتظام کرایا۔ نکاح کی رسم ہوئی اور مہیش چندر نے اپنا نام بدل کر نواز شریف رکھ لیا۔ پھر دونوں واپس ممبئی روانہ ہوگئے۔

مہیش چندر نواز شریف تو بن گیا مگر اس کی کتابیں مہیش چندر کے نام ہی سے چھپ رہی تھیں۔ وہ نہ ہی نماز ادا کرتا اور نہ ہی مسجدوں میں حاضری دیتا۔ شیریں تو خیر معمول کی طرح اپنے مذہب کی پابند رہی۔ مہیش اور شیریں کی جوڑی تب تک ایک ساتھ رہی جب تک مہیش نے آخری سانس نہ لی۔ آخری دم پر مسئلہ یہ تھا کہ میّت کا کیا کیا جائے۔ جلایا جائے یا دفنایا جائے؟ انصاف کہتا تھا کہ لاش کو بنا کسی پوجا پاٹ کے الیکٹرک کرمٹوریم کے سپرد کیا جانا چاہیے کیونکہ مہیش چندر دہریہ تھا۔ مگر اس کے دوست رشتہ داروں نے نہیں مانا۔ ایک گروہ لاش کو جلانے کے حق میں تھا اور دوسرا گروہ اس کو دفنانے کے حق میں تھا۔ آخر کار رشتہ داروں کی بات مانی گئی اور لاش کا باضابطہ داہ سنسکار کیا گیا۔

کچھ روز پہلے مجھے ان کا ایک ناول بک سٹال پر نظر آیا۔ ٹائٹل تھا۔ ''عورت انصاف مانگتی ہے۔''

مجھے زیر لب ہنسی آ گئی۔ میں نے چُپ چاپ وہ کتاب اٹھائی، اس کی قیمت ادا کی اور اس کو گھر لے گیا تا کہ دیکھ لوں کہ مہیش چندر عورت کے بارے میں کیا نظریہ رکھتا تھا۔

☆☆☆

اچھے دِن

یہ ایشور بھی عجیب شے ہے۔آدھی ادھوری دنیا بنالی۔ جہاں دیکھو وہاں ناداری، نامیسّری اور غیر طمانیت...! اس پر طرّہ یہ کہ ہر جگہ دلال بنا رکھے ہیں۔کوئی جنت کا وعدہ کررہا ہے، کوئی بیماری سے نجات دلانے کا، کوئی مالا مال کرنے کا اور کوئی سکھ سمردھی دلانے کا۔ اور لوگ بیوقوف بنتے جارہے ہیں۔ان کی خوشنودی کے لیے رات دن ایک کرتے ہیں۔ یہ خودساختہ سادھوسنت، پیر فقیر اپنے آپ کو ایشور کے فیلڈ افسر بتلاتے ہیں اور اس کے نام پر ہمیں ہر موڑ پر ٹھگ لیتے ہیں۔ ایسا کرو، ویسا کرو تبھی پرماتما پرسن ہوں گے اور آپ کا کلیان کریں گے۔پھر ہماری ضعیف الاعتقادی کی بھی تو کوئی حد نہیں، بھروسہ کیے جاتے ہیں۔ کیوں نہ کریں، مجبور جو ہیں۔موت اور بیماری کی تلوار جو سر پر لٹک رہی ہے۔لاکھوں لوگ ان آستانوں پر امیدیں لے کر حاضر ہوتے ہیں مگر سب کی سمسیائیں تھوڑے ہی حل ہوتی ہیں۔ہاں جن کی ہوتی ہیں اور جو زندہ رہتے ہیں وہ ہر دم ان کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں لیکن جو مہلک بیماریوں کی نذر ہو جاتے ہیں وہ کسی کو کیا بتلا سکتے ہیں کہ ہم بھی مرادیں پانے کے لیے چلے گئے تھے مگر مہلک مرض نے دبوچ لیا اور ہماری عبادت اکارت گئی۔

سوبھا دیوی کا پتی، ایکناتھ بھی ایسی ہی ایک مہلک بیماری کی زد میں آگیا اور آخر میں راہ عدم اختیار کرلی۔ کئی بار سوبھا دیوی اور ایکناتھ نے آستھا کے ان مقامات پر حاضری دی تھی۔ گنڈے تعویز بنوائے تھے۔جو کچھ بھی جمع پونجی تھی وہ لٹا دی تھی۔ مگر ہونی تو ہو کر رہ گئی۔حالانکہ ایکناتھ کا ہونا یا نہ ہونا سوبھا دیوی کے لیے ایک برابر تھا۔کئی بار اس کے دل سے آہ نکلتی اور وہ چاہتی

کہ مر ہی جاتا تو بہتر ہوتا مگر دوسرے ہی پل وہ اپنے سر کو جھٹکتی جیسے اس نے کوئی جرم کیا ہو۔ پتی پرمیشور ہوتا ہے اور اسے ایسا نہیں سوچنا چاہیے۔ جب شادی ہوئی تھی اس وقت وہ بارہ سال کی تھی اور شوہر کی عمر پندرہ سال تھی۔ عام طور پر غریب باپ اپنی بیٹی کو بوجھ سمجھ لیتا ہے اور چاہتا ہے کہ جلدی سے جلدی اس کے کندھے سے یہ بار اتر جائے۔ بچپن سے انھوں نے اب جوانی میں قدم رکھا تھا۔ ہمارے معاشرے میں لڑکیاں شادی کے بعد پیار کرنا سیکھتی ہیں۔ سوبھا دیوی نے کئی خواب دیکھے مگر دھیرے دھیرے وہ ایک ایک کر کے ٹوٹتے چلے گئے۔ ساری فضا پر قنوطیت چھا گئی کیونکہ زندہ رہنا دوبھر ہو رہا تھا۔ ایکناتھ جب شام کو گھر لوٹ آتا تو نشے میں دھت۔ دن بھر نہ جانے گھر سے باہر کہاں مارا مارا پھرتا رہتا تھا۔ کسانی تو رہی نہیں۔ تین سال سے سارے علاقے کو قحط سالی نے دبوچ لیا تھا۔ ساری زمین پاپڑ کی طرح سوکھ گئی تھی۔ مویشیوں کے پنجر جہاں تہاں بھیانک سوکھے کی گواہی دے رہے تھے۔ لوگ جوں توں زندگی گزار رہے تھے۔ جو جوان تھے وہ شہروں میں جا کر مزدوری کرنے لگے۔ باقی ماندہ دہقان گھنٹوں آسمان کی جانب ٹکٹکی باندھے آنکھوں سے آنسو برساتے رہے۔ اس کے باوجود ایشور کو ترس نہ آیا اور کہیں سے کوئی بادل کا ٹکڑا بھی نظر نہیں آیا۔ تین سالوں سے زندگی اسی ڈھرے پر چل رہی تھی۔ علاقے کی حالت دیکھ کر بنکوں اور سرکاری ایجنسیوں نے ہاتھ کھڑے کر دیے اور کوئی قرضہ دینے کو تیار نہ تھا۔ صرف مقامی ساہوکار تھے اور ان کے بالکسر! اس علاقے میں کوئی ایسا کسان نہیں تھا جو قرضے کے بوجھ تلے دبا نہ تھا۔ نہ لیتا تو کیسے جی پاتا۔

آئے روز ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر بڑی بڑی سرکاری سکیموں کے بارے میں اعلان ہو رہے تھے۔ غریبی ہٹانے کا دعویٰ کیا جاتا تھا۔ کروڑوں روپے کی سرمایہ کاری کے پلان پیش کیے جاتے تھے۔ مگر زمینی حقیقت یہ تھی کہ گاؤں میں تین سال سے سوکھا پڑا تھا اور لوگ پانی کی بوند بوند کے لیے ترس رہے تھے۔ ہفتے میں ایک بار پانی کا ٹینکر دکھائی دیتا جس کے لیے مارا ماری ہوتی اور اسی پانی کو ہفتے بھر استعمال میں لایا جاتا تھا۔

زندگی جب کٹھن ہو جاتی ہے تو انسان خود کو بھول جانے کی سبیلیں ڈھونڈتا رہتا ہے۔
اسے اپنے بال بچوں کی حالت دیکھی نہیں جاتی۔ کوئی تاڑی پی کر اپنے غم غلط کر لیتا ہے اور کوئی نشہ کر کے۔ شاید ایشور نے بھانگ اور افیون اسی وقت کے لیے پیدا کیے ہوں۔ آمدنی کے اور ذرائع تو تھے نہیں، نہ کلیں، نہ ملیں، نہ کارخانے نہ کانیں۔ نہ پانی، نہ بجلی، نہ دواخانہ، نہ اسکول۔ دور دور تک ریل گاڑی نظر نہیں آتی تھی۔ بس ایک روزگار تھا، کھیتی باڑی کا مگر وہ بھی تین برسوں سے عنقا ہو گیا تھا۔ سمجھ نہیں آتا کہ یہ سرمایہ کار اور سرکار ایسے علاقوں میں کارخانے کیوں نہیں لگواتے بلکہ اس کے برعکس کسانوں سے زرخیز زمینیں چھین لیتے ہیں۔

ایکناتھ اپنی بیوی کو بہت پیار کرتا تھا مگر جب شراب کا نشہ چڑھ جاتا تو آپے سے باہر ہو جاتا۔ سوبھا دیوی خاموشی سے یہ سب کچھ برداشت کر لیتی تھی کہ ماں نے اسے سکھایا تھا کہ پتی جیسا تیسا بھی ہو، بیوی کا فرض ہے اس کی اطاعت کرنا۔ مار پیٹ کے بعد جب ایکناتھ اسے پیار کرتا تو وہ سب کچھ بھول جاتی۔ ایکناتھ نے بہت کوشش کی کہ وہ زندہ رہے، کم سے کم اپنے بچوں کے واسطے مگر نشے نے اس کی زندگی کا سارا رس نچوڑ لیا اور وہ سوکھ کر کانٹا ہو گیا۔ پھر جگر کی بیماری بھی ایسی لگ گئی کہ بسترِ مرگ سے کبھی اٹھ نہ پایا۔

گھر کے برتن تک بک گئے۔ جو کچھ بھی تھا وہ سب ختم ہو گیا۔ تین لمبے سال.....! کوئی آمدنی نہیں۔ اب تو سیٹھ ساہوکار بھی قرضہ دینے سے کترانے لگے تھے۔ کوئی کام بھی تو نہیں تھا جو وہ کر لیتی۔ بس صبح شام باقی ہم وطنوں کی طرح اچھے دنوں کا انتظار کرتی رہتی۔

اب تو ایکناتھ بھی نہیں تھا۔ سوبھا اکیلی تھی اور تین بچے تھے۔ ایک سترہ سال کا بڑا لڑکا تھا، اس کے جنم کے دو سال بعد منجھلی لڑکی پیدا ہوئی تھی جس کے بعد سنجھلا لڑکا پیدا ہوا جو ابھی بہت چھوٹا تھا۔ بس یہی کچھ چھ سات سال کا۔ کچھ روز پہلے بڑے لڑکے کو بہت بخار آیا، ہسپتال کا تو کہیں نام و نشان ہی نہ تھا۔ سوبھا نے مقامی وید سے منت سماجت کر کے اس کا معائنہ کروایا لیکن جو دوائیاں اس نے تجویز کیں انھیں خریدنے کی سکت کہاں تھی۔ وہ اس کاغذ کے پرچے کو دیکھتی رہ گئی

جب تک اس کے بیٹے نے اس کی گود میں دم توڑ دیا۔ لاچار و بے بس وہ مبہوت دیکھتی رہ گئی۔

کچھ عرصہ بعد وہ صبح سویرے لڑکی کی انگلی پکڑ کر گھر سے نکل پڑی۔ جب وہ لوٹ آئی تو اکیلی تھی۔

سوبھا دیوی کے کانوں میں کسی دلال نے یہ بات ڈال دی تھی کہ اگر وہ اپنی اولاد بیچ دے تو کافی سارا روپیہ مل سکتا ہے بشرطیکہ اولاد چلنے پھرنے کے قابل ہو۔ لڑکی ہوگی تو پانچ ہزار اور لڑکا ہوگا تو دو ہزار۔ گھر آکر اس نے اس بات پر بہت سوچ بچار کر لیا۔ آخر کار سوبھا نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنی بیٹی کو بیچ دے گی۔ اپنے لخت جگر کو خود سے دور کرنا کتنا مشکل کام ہوتا ہے۔ پانچ ہزار لے کر جب وہ انسانوں کی منڈی سے نکلی تو اس کی بیٹی بہت روئی تھی، آسمان سر پر اٹھایا تھا مگر اس نے سنی ان سنی کر دی اور تیز تیز قدم اٹھا کر وہاں سے بھاگ نکلی۔ اسے اپنی بیٹی کے حشر کا بخوبی اندازہ تھا مگر کیا کرتی۔ خود جینے کے لالے پڑے تھے تو بچوں کو کیا کھلاتی۔ بیٹی کو بچاتی تو دوسرا بیٹا بھی چلا جاتا۔

ابھی گھر میں قدم ہی رکھا تھا کہ سیٹھ کے کارندے چوکھٹ پر ملے اور قرضے کا تقاضا کرنے لگے۔ کسان زندگی سے نجات پا سکتا ہے مگر قرض سے مکتی پانا اس کے بس میں نہیں۔ اور یہ وہی کسان ہے جس کی محنت اور پسینے کی بدولت ہم سب سانسیں لیتے ہیں۔ سوبھا نے چپکے سے تین ہزار ان کے ہاتھ میں رکھ دیے اور حساب بے باک کر دیا۔ اس کا مطلب یہ بھی تو تھا کہ آگے کے لیے راستہ صاف ہوگیا اور وہ سیٹھ سے دوبارہ ادھار لے سکتی تھی بشرطیکہ آسمان پر بادل نظر آئیں۔ اس نے سوچا کہ بیل گائے تو رہے نہیں، ہل جوتنے کے لیے خود کو اور بیٹے کو باندھ لے گی اور ہمسائے سے ہل چلوائے گی جس کے عوض وہ خود اس کے کھیتوں میں کام کرے گی۔ مگر یہاں تو نہ بادل آنے تھے اور نہ آئے۔

یہ سال بھی یوں ہی گزر گیا۔ کہیں پانی کا ایک قطرہ بھی نظر نہیں آیا۔ آسمان جھلس رہا تھا۔ باقی ماندہ دو ہزار بھی ایسے اُڑ گئے جیسے کافور۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ سب کیسے

ہوا۔ پھر ایک روز سوبھا دیوی اپنے بیٹے سمیت غائب ہوگئی۔ سنا ہے کسی نے اسے صلاح دی تھی کہ شہر جا کر مزدوری کر لے، پیٹ تو بھر سکتی ہے۔ یہی سوچ کر وہ شہر کی جانب چل دی۔

بہت عرصہ ہوا کہ اس کی کوئی خیر خبر نہیں ملی۔ اس دورانیے میں اس نے گاؤں کا رخ بھی نہیں کیا۔

ایک روز اس کی تصویر اخباروں میں چھپ گئی۔ لکھا تھا کہ وہ اجتماعی زنا کا شکار ہوگئی ہے۔ بات یوں تھی کہ جس کنٹریکٹر کے پاس وہ کام کر رہی تھی اس کے کچھ دوستوں نے رات کو دارو پی کر اسے لیبر کیمپ سے اٹھالیا اور اپنی جیپ میں لے گئے۔ دراز سیاہ بال، کتابی چہرہ، تھل تھل کرتی چھاتیاں اور لچکیلی کمر۔ اس کا حسن اس کا دشمن بن گیا۔ ایک، دو، تین، چار اور پانچ۔ ایک کے بعد ایک اسے نوچتا رہا۔ وہ چیختی رہی، چلاتی رہی مگر سننے والا کوئی نہ تھا۔ اُدھر لیبر کیمپ میں اس کا بیٹا روتا رہا اور بین کرتا رہا مگر اس کی کون سنتا۔ آخر کار ان وحشی درندوں نے اس کو موت کی نیند سلا دیا اور سڑک سے دور ایک ویرانے میں پھینک دیا۔

پولیس کو دوسرے روز لاش مل گئی اور تفتیش شروع ہوگئی۔ کئی روز سانحہ اخباروں اور ٹیلی ویژن چینلوں کی سرخی بنتا رہا۔ مگر تفتیش میں سیاست دان اڑنگے ڈالتے رہے۔ پولیس پر دباؤ پڑتا رہا اور معاملہ کو رفع دفع کرنے کی کوشش ہونے لگی۔ اُدھر بیٹا لاپتہ ہوگیا۔ اس کے بارے میں کسی کو کوئی خبر نہیں ملی۔

گاؤں والے سوبھا دیوی کی خبر پڑھ کر غمزدہ ہوگئے۔ تاہم وہ ابھی بھی اچھے دنوں کا انتظار کر رہے ہیں...!

ماسٹر جی

''ارے بھائی یہ کیا ہو رہا ہے؟ ہمارے اس چھوٹے سے گاؤں میں اتنی ساری بھیڑ کہاں سے اُمڈ آئی ہے؟'' ایک سادہ لوح کسان نے دوسرے سے پوچھا۔

''سنا ہے کوئی ماسٹر مر گیا ہے۔ ماتم میں شریک ہونے کے لیے دور دراز علاقوں سے گیانی پُرش چلے آئے ہیں۔'' دوسرے نے جواب دیا۔

یہ آزادی سے پہلے کا قصہ ہے۔ ایک چھوٹے سے گاؤں میں ماتم کرنے والوں کا اتنا سارا ہجوم دیکھ کر وہاں کے سیدھے سادے، ان پڑھ اور ناواقف لوگ حیران ہو رہے تھے۔ گاؤں والوں نے انسانوں کا ایسا اژدہام پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ ہاں کبھی کبھار ماسٹر جی کو ڈھونڈ نے کچھ پڑھے لکھے لوگ آتے تھے، ان کا ایڈریس پوچھتے تھے اور پھر کچھ وقفے کے بعد ماسٹر جی سے مل کر واپس چلے جاتے تھے۔ خود امر چند بھی گاہے بہ گاہے کئی دنوں کے لیے گاؤں سے غائب رہتا تھا اور سنتے تھے کہ شہر میں بڑے بڑے جلسوں جلوسوں میں حصہ لیتا تھا۔ اس کے باوجود اس کی سادگی اور طور طریق میں کبھی کوئی فرق نہیں آیا۔ وہ اپنے آپ کو گاؤں والوں سے کبھی الگ نہیں کر سکا۔

امر چند کی ارتھی کو کندھا دینے کے لیے اس کے کئی طلبہ آئے تھے جنھیں اس نے ماضی میں نہ صرف پڑھایا تھا بلکہ زندگی گزارنے کا سلیقہ بھی سکھایا تھا۔ ان میں سے کئی طالب علم بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہو چکے تھے۔ انھوں نے ماسٹر جی کی انتم یاترا کا سارا انتظام اپنے ہاتھوں میں لے لیا کیونکہ ماسٹر جی کا کوئی وارث نہیں تھا۔ صرف ایک بیوہ بہن تھی وہ کچھ سال پہلے وفات پا چکی تھی۔

ماسٹر جی بے چارے تو کسمپرسی میں دن گزار رہے تھے یہاں تک کہ ان کو جب آنتوں میں سوزش ہوئی تو انھیں مالی تنگدستی کے سبب مقامی ڈاکٹروں پر قناعت کرنی پڑی۔ اب تو ان کے جانے کے بعد گھر مکمل طور پر خالی ہو گیا۔ ماسٹر جی نے تو اپنے مستقبل کے بارے میں کبھی سوچا بھی نہیں۔ وہ زمانہ ہی کچھ اور تھا۔ اکثر لوگ آدرشوں اور اصولوں کے تابع ہوتے تھے اور گھر بار، رشتے ناتوں کو نظر انداز کر کے وطن پر شہید ہونے کے لیے تیار ہو جاتے۔ ان دنوں آزادی کی لڑائی زوروں پر تھی اور اس کی رہنمائی آدرش وادی، ستیہ گرہ کے حامی، روحانیت کے علم بردار اور عدم تشدد کے پجاری مہاتما گاندھی کر رہے تھے۔ وہ جابر و ظالم انگریزوں سے نہتے ہاتھوں لوہا لے رہے تھے اور سارا ہندوستان ان کے اشارے پر مر مٹنے کو تیار ہو جاتا تھا۔

مہاتما گاندھی نے نہ صرف انگریزوں سے آزادی پانے کی تحریک شروع کی تھی بلکہ ہندو سماج کے بُرے رسم و رواج کے خلاف بھی محاذ کھول دیا۔ بال وِواہ کے خلاف اور بیواؤں کی دوسری شادی کے لیے انھوں نے ایک زبردست مہم شروع کر دی جس میں وہ کامیاب رہے۔ اسی طرح انھوں نے غیر ملکی اشیا کا بہشکار، سرکار کے غلط قانونوں کے خلاف عدم تعاون اور نمک کا آندولن بھی چلایا۔ غرض سارے ہندوستان میں جاگرتی لانے میں کامیاب ہو گئے۔ امر چند خود بال وِواہ کا شکار ہو چکے تھے۔ بچپن ہی میں والدین نے ان کو ایک ناپسندیدہ لڑکی سے ازدواجی بندھن میں باندھا تھا جو طبعیت سے عیب جو، چڑچڑی اور جھگڑالو تھی۔ امر چند نے ابتدا میں کافی صبر کیا، پھر اسے رہا نہ گیا، اس لیے اپنی بیوی کو چھوڑ کر ایک بیوہ سے دوسری شادی کر لی جوان کے لیے نعمت ثابت ہوئی اور عمر بھر ان کا ساتھ دیتی رہی۔ اس کی حوصلہ افزائی کی وجہ سے ہی ایک ادنیٰ ماسٹر ادب کی دنیا پر چھا گیا۔ سچ کہا ہے کسی نے کہ ہر بڑے انسان کے پیچھے عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔ مگر شومیٔ قسمت وہ بھی چھ سال پہلے سرگباش ہو گئی اور اپنے پیچھے کوئی اولاد نہیں چھوڑ سکی۔

ماسٹر جی کا داہ سنسکار کر کے طلبہ واپس آ رہے تھے اور راستے میں اپنے ماسٹر جی کی یادوں کو ایک دوسرے کے ساتھ بانٹ رہے تھے۔ امر چند نے اپنے عرصۂ حیات میں ایک دلت طالب

علم ہری چند کو شرن دے کر اس کی زندگی سنواری تھی، اس کا سارا بوجھ اٹھایا تھا اور اس کو پڑھا لکھا کر اس قابل بنایا تھا کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا۔ حالانکہ ہری چند کو اچھی سرکاری نوکری مل رہی تھی مگر اس نے کالج میں پڑھانے کو ترجیح دی اور اس طرح ماسٹر جی کے نقش قدم پر چلتا رہا۔ آج بھی ہری چند آگے آگے تھا اور اسی نے ماسٹر جی کی چِتا کو اگنی دکھائی تھی ۔ واپسی پر وہ سلیم احمد سے گویا ہوا۔

''بھائی سلیم، ماسٹر جی نہ ہوتے تو میں آج اس مقام پر نہ ہوتا۔ انھوں نے مجھ یتیم کو اپنایا اور پال پوس کر بڑا کیا۔ علم کے نور سے میری زندگی منوّر کی۔ میرا سارا وجود ان کا مقروض ہے۔ میں نے ان کو کبھی کسی سے نفرت کرتے نہیں دیکھا۔ وہ سبھی انسانوں سے محبت کرتے تھے۔''

سلیم احمد نے جواب دیا۔ ''ہاں ہری چند، تم سچ کہہ رہے ہو۔ انھوں نے مجھے بھی رہنمائی کر کے صحیح راستے پر لگایا۔ میرے گھر میں دولت کی ریل پیل تھی ۔ میرے والد صاحب محکمۂ مال سے وابستہ تھے۔ اپنی تنخواہ کے علاوہ کافی بالائی آمدنی تھی ۔ مجھے ٹوکنے والا کوئی نہ تھا۔ اس لیے میں راہ سے بے راہ ہو گیا تھا۔ مگر ایک روز ماسٹر جی نے اسکول میں مجھے اپنے پاس بلایا۔ میرے خلاف ہیڈ ماسٹر کو کئی شکایتیں ملی تھیں۔ اسٹاف میٹنگ میں طے ہوا تھا کہ مجھے وارننگ دی جائے اور اگر میں سدھرا نہیں تو مجھے اسکول سے نکال دیا جائے۔ مگر ماسٹر جی نے ہیڈ ماسٹر کو بھروسہ دلایا کہ وہ مجھے راہ راست پر لانے کی کوشش کریں گے۔ ماسٹر جی سے ملتے وقت میں نے بڑی ہیکڑی دکھائی مگر انھوں نے بالکل بُرا نہیں مانا۔ بڑی شفقت سے ملے اور مجھے سمجھانے لگے کہ ''زیست ایک نعمت ہے اور اس کا صحیح استعمال کرنے سے انسان کامیاب ہوتا ہے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ اس چھوٹی سی عمر میں کچھ نہیں تو کم سے کم دوسرے لوگوں کی مدد کرے، غریبوں اور مفلسوں میں روپے پیسے یا پھر اپنے پرانے کپڑے، کتابیں اور دوسری استعمال کی ہوئی چیزیں بانٹ دے تا کہ وہ بھی گزارہ کر سکیں۔ اسلام میں اسی لیے زکوٰۃ کی تاکید کی گئی ہے۔ تم تو ایک اچھے خاندان سے تعلق رکھتے ہو اور تمھارے پاس تو بہت کچھ ہے پھر تم ان چیزوں کو اچھے کام میں کیوں نہیں لگاتے۔''

''کیا تم نے ان کے کہنے پر عمل کر لی؟''

''ابتدا میں تو کچھ ہچکچاہٹ ہو رہی تھی مگر آہستہ آہستہ ان کی باتیں میرے دل میں گھر کر گئیں اور میری تقلیب ماہیت ہو گئی۔ مجھے پڑھنے لکھنے سے رغبت ہونے لگی، بی اے، ایل ایل بی کی ڈگریاں حاصل کر لیں اور ساتھ ہی فلاحی کاموں میں شرکت کرنے لگا۔ خدا کا شکر ہے کہ میری وکالت چل نکلی اور میں اس وقت کئی فلاحی تنظیموں کے ساتھ وابستہ ہوں۔''

اسی دوران ایک اور سابق طالب علم گفتگو میں شریک ہوا۔ ''ماسٹر جی کی شخصیت تو بہت پُر اثر تھی۔ شکل وصورت سے تو نحیف، لاغر اور کم گو تھے مگر نہ جانے کیسے مخاطب کو اپنے سحر میں باندھ لیتے تھے۔ سننے والا تو فوراً قائل ہو جاتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ میں دو بار میٹرک کے امتحان میں ناکام ہوا۔ پھر کیا تھا۔ میں نے تعلیم ترک کرنے کی ٹھان لی۔ اتفاق سے میری ملاقات ماسٹر جی سے ہوئی اور انھوں نے مجھے قریب دو گھنٹے اپنے پاس بٹھایا، گرم جوشی کے ساتھ کامیابی اور ناکامی کے درمیان کھنچی باریک سی لکیر پر ولولہ خیز لیکچر دیا اور یہ سمجھایا کہ ہمت کرنے سے کوئی بھی مرحلہ طے کیا جا سکتا ہے۔ کچھ اور نکتے بھی سمجھائے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس سال میں میٹرک میں اچھا ڈویژن لے کر کامیاب ہوا اور اب اچھی خاصی تجارت کر رہا ہوں۔ بھگوان ان کی آتما کو شانتی دے۔''

کچھ وقت کے بعد سبھی ماسٹر جی کے گھر پہنچے۔ چھوٹا سا گھر تھا۔ اس لیے سب مل بیٹھ کر اس بات پر غور کرنے لگے کہ ماسٹر جی کے گھر اور ہزاروں کتابوں کا کیا کیا جائے۔ آخر کار فیصلہ یہ ہوا کہ اس گھر کو لائبریری میں تبدیل کیا جائے اور ان کتابوں کے لیے الماریاں خرید لی جائیں تاکہ ان کو قرینے سے رکھا جائے۔ پھر کسی ریٹائرڈ شخص کو لائبریری کا کام اور کتابوں کی دیکھ بھال کے لیے مقرر کیا جائے۔ سبھی نے اپنی جیب سے رقم دینے کا وعدہ کر لیا اور اس طرح 'امر چند لائبریری' کا قیام عمل میں لایا گیا۔

بہت چھوٹا سا قدم تھا مگر مثبت تھا۔ آج وہی لائبریری بہت بڑی لائبریری میں تبدیل ہو گئی ہے۔ اب تو یہاں لاکھوں کتابیں ہیں، بیسیوں ملازم ہیں، سرکار نے اسے اپنی تحویل میں لیا ہے اور ہر سال گرانٹ ملتی ہے۔ وہ چھوٹا سا گاؤں بھی اب اہم قصبہ بن چکا ہے۔ لائبریری کے

سامنے امر چند کا ایک بہت بڑا مجسمہ کھڑا ہے جس کو دیکھ کر راہ گز سجدہ ریز ہو جاتے ہیں۔ ☆☆

آج جانے دو

جمنا گہری سوچ میں پڑ گئی۔ سامنے انگیٹھی میں کوئلے دہک رہے تھے اور اس پر چاول چڑھا رکھے تھے۔ اسے اپنی زندگی انہی کوئلوں کی مانند لگ رہی تھی جو ابتدا میں توانائی سے لبریز تھے۔ تھوڑی سی آگ دکھا کر بھبھک اٹھے اور ساری توانائی دھواں دھواں ہوگئی۔ اسے معلوم ہے کہ وہ تب تک سلگتے رہیں گے جب تک مکمل طور پر راکھ نہ ہوں گے۔ جمنا بھی بچپن میں انرجی سے بھرپور تھی، اچھلنا کودنا، پہاڑی راستوں پر کُللیلیں کرنا اس کا روزمرہ تھا۔ شباب آنے سے قبل ہی ازدواجی زنجیر میں باندھ دی گئی اور پھر دہکتی جوانی جھول نکالنے میں صرف ہوگئی۔ تین بیٹیاں اور ایک بیٹا پیدا کر کے ماند پڑ گئی۔

اس کا شوہر رتی رام ایک کنٹریکٹر کے پاس کام کرتا تھا جو اس کو مقامی صنعتی اداروں، سڑک ٹھیکے داروں یا پھر بلڈروں کے پاس کام دلاتا تھا اور اپنا کمیشن کاٹ کر باقی ماندہ مزدوری ہاتھ میں تھما دیتا تھا۔ باوجودیکہ ریاستی سرکار نے کم سے کم اجرت کا قانون بنا رکھا ہے لیکن نہ تو اس کو پوری اجرت مل جاتی اور نہ وقت کی پابندی کا خیال رکھا جاتا۔ محنت کش طبقے کا اس سے بڑا استحصال اور کیا ہو سکتا ہے اور وہ بھی سرکار اور سرکاری افسروں کی پوری نگرانی میں۔ ناخواندہ، غریب اور لاچار مزدور تو احتجاج بھی نہیں کر سکتے، چپ چاپ جو مل جاتا ہے وہ غنیمت سمجھتے ہیں۔ لیبر قانون، سوشلزم اور انسانی حقوق دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ کوئی کچھ کہے تو اسے برخاست کیا جاتا ہے اور اس کے لیے روزگار کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ مایوسی کے سبب کچھ نوجوان شہروں کا

رخ کرتے ہیں مگر وہاں کے حالات اس سے بھی بدتر پاتے ہیں۔ بہر حال سر اوکھلی میں دے کر پھر موسلوں سے کیا ڈرنا۔ ان کی انا گھر واپس جانے کی اجازت نہیں دیتی، اس لیے حالات کے ساتھ سمجھوتا کرتے ہیں۔ بہت پرانا قول ہے کہ پارسناتھ سے چکی بھلی جو آٹا دیوے پیس، کڑھ نُر سے مُرغی بھلی جو انڈے دیوے بیس۔

رتی رام کو ہفتے کے بعد اجرت مل جاتی اور وہ گھر جانے کے بجائے سیدھا کلال کے پاس حاضری دیتا اور اس کا حساب چکتا کر دیتا۔ پھر بچتا ہی کیا تھا، اُدھر آجر نے رقم دے دی اور اِدھر اس کا قریباً آدھا حصہ شراب خانے کی نذر ہو جاتا۔ جسم کی تھکان دور کرنے اور ذہنی الجھنوں کو کم کرنے کے لیے شراب پینا اور کھینی کھانا تو غریب مزدوروں کی مجبوری ہے۔ پھر بھلا رتی رام اس کے بغیر کیسے رہ سکتا تھا۔ بچا کھچا پیسہ وہ جمنا کے ہاتھ میں رکھ دیتا جو ہر بار اسے سوال کرتی کہ اس قلیل رقم پر چھ نفوس کی گزر بسر کیسے ہوگی؟ اس کے پاس جمنا کے سوالوں کا کوئی جواب نہ ہوتا۔ اکثر و بیشتر وہ حجت کرتی، بچوں کی حالت پر غور کرنے کی ضد کرتی اور شراب چھوڑنے کے لیے اصرار کرتی۔ نتیجتاً رتی رام کو غصہ آجاتا اور وہ جمنا کو چپ کرانے کے لیے ہاتھ اٹھاتا۔ شراب پی کر اسے یہ احساس نہ ہوتا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ بیوی کو مکّوں، گھونسوں اور لاتوں سے خاموش کرنا تو چل جاتا مگر جب کچھ زیادہ ہی چڑھی ہوتی تو ڈنڈے کا استعمال بھی کرتا۔ اس وقت جمنا کی حالت رقت انگیز اور قابل رحم ہوتی، کپڑے پھٹ جاتے، بدن پر جگہ جگہ نیل پڑ جاتے، منہ سے خون بہہ جاتا اور وہ لگاتار آہ و زاری کرتی۔ تاہم وہ لاچار تھی، جاتی کہاں، دور دور تک کوئی بھی اپنا نہیں تھا، میکے کے سبھی لوگ مر کھپ چکے تھے اور بچے کمسن تھے حالانکہ وہ ماں کی حالت دیکھ کر آسمان سر پر اٹھاتے۔ ہمسائے بھی اس وقت سامنے آکر مدد کرنے سے گریز کرتے، پھر دوسرے روز رتی رام کی غیر حاضری میں جمنا کو دلاسا دیتے۔

شروعاتی دور میں تو جمنا احتجاج کر لیتی مگر جستہ جستہ وہ ٹھنڈی پڑ گئی اور اس کو بچوں کی فکر ستانے لگی۔ ایک پڑوسی عورت نے اسے مشورہ دیا کہ وہ چند بڑے گھروں میں صفائی کرنے اور

برتن مانجھنے کا کام کرلے، کچھ آمدنی ہوجائے گی اور اس رقم سے وہ اپنے کنبے کا پیٹ پال سکتی ہے۔ مشورہ معقول تھا۔ جمنا نے اسی کی وساطت سے کچھ فاصلے پر چند گھروں میں کام ڈھونڈ لیا۔ تجربہ اچھا رہا۔ نہ تو اب شوہر سے لڑنے بھڑنے کی فرصت تھی اور نہ گھر میں پیسے کی قلت۔ اُدھر رتی رام اپنی ہی دھن میں مست رہتا اور اپنی آمدنی سے زیادہ سے زیادہ حصہ فضول خرچی میں صرف کرتا۔

آج کچھ انہونی سی بات ہوئی۔ رتی رام گذشتہ ہفتے کی اجرت لے کر واپس آ ہی رہا تھا کہ فُٹ پاتھ پر گیروے کپڑوں میں ملبوس ایک ایسے شخص پر نظر پڑی جس کے سامنے ایک سفید چادر بچھی ہوئی تھی۔ اس پر بہت سارے کارڈ قرینے سے رکھے ہوئے تھے جن پر انسانی زندگی سے متعلق مثبت و منفی دونوں قسم کی باتیں لکھی ہوئی تھیں۔ کارڈوں کی دائیں طرف ایک پنجرہ تھا جس میں ایک توتا بند تھا جو باہر نکل کر سیکڑوں کارڈوں میں سے ایک چن لیتا اور رمال وہ کارڈ اس کی چونچ سے چھین کر پڑھ لیتا تھا۔ سامنے بیٹھے آدمی کے لیے یہی بھوشیہ وانی ہوتی تھی۔ کس کے نصیب میں کیا لکھا تھا اسی ایک کارڈ پر منحصر تھا۔ یہ طریقہ لاٹری سے مشابہ تھا۔ نجومی کی خود اپنی حالت ایسی تھی کہ سردی کے باوجود اس کے بدن پر مناسب گرم کپڑے نہیں تھے۔ معلوم نہیں کہ اس نے اپنا بھوشیہ دیکھا تھا یا نہیں مگر دوسرے لوگوں کو وہ بڑے اعتماد کے ساتھ ان کا مستقبل بتاتا تھا اور وہ اپنی جیب خالی کر کے اطمینان سے واپس گھر چلے جاتے۔ اس کارروائی کے لیے اس نے پچاس روپے کی فیس رکھی تھی مگر ساتھ ہی وہ گاہکوں کے ہاتھ کی لکیریں بھی دیکھتا جس کے لیے وہ مزید پچاس روپے کی رقم اینٹھ لیتا تھا۔ رتی رام تھوڑی دیر کے لیے ٹھٹھکا، وہ دست شناس کے سامنے بیٹھے دو آدمیوں کو دیکھتا رہا جو اپنے بازو آگے کر کے اپنا مستقبل جاننے کے لیے بے تاب ہو رہے تھے۔ اس کی جیب میں سات سو روپے تھے جو اس ہفتے کی کمائی تھی۔ اس رقم میں سے اسے شراب فروش کو تین سو روپے دینے تھے جس کی وہ قرض کی مے پی چکا تھا۔ آخر کار وہ بھی رمال کے جال میں پھنس گیا اور اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ نجومی نے رتی رام کی قسمت جاننے کے لیے توتے کو پنجرے سے آزاد کیا۔ توتا کارڈوں کے اوپر پھدکنے لگا اور تھوڑے وقفے کے بعد ڈھیر میں سے ایک کارڈ اپنی چونچ سے نکال

لایا۔ نجومی نے اس کی چونچ سے کارڈ چھین لیا اور اس کو پڑھنے لگا۔

''تمھاری زندگی بڑی الجھی ہوئی ہے۔ آمدنی بہت کم ہے اور خرچہ روز بروز بڑھتا جارہا ہے۔ بیوی اور بچے کسمپرسی کی حالت میں جی رہے ہیں۔ بیوی کے ساتھ عام طور پر جھگڑا ہوتا رہتا ہے۔ بچے بیمار رہتے ہیں۔ تمھاری کچھ بری عادتیں ہیں جن کے سبب تم بہت پریشان رہتے ہو۔ بہتر یہ ہوگا کہ تم اپنی زندگی سنوارنے کے لیے کوئی اُپائے ڈھونڈلو۔''

''اُپائے؟ جی اس کا کیا اُپائے ہوسکتا ہے؟'' رتی رام نے نجومی سے پوچھ لیا۔

''بندو، اس کے لیے صرف ایک اُپائے ہے اور وہ ہے رُدراکش پہننا۔ اگر چاہو تو میں ایک رُدراکش تم کو دے سکتا ہوں جس کو تم دھاگے میں پرو کر گلے میں پہن سکتے ہو۔ یہ میں نے نیپال سے لایا ہے اور بہت فائدہ مند رہتا ہے۔ کئی لوگوں کو اس کے پہننے سے لابھ ہوا ہے اور وہ مجھے دعائیں دیتے ہیں۔ چند ایک نے مجھے اس بارے میں سندیں بھی عطا کی ہیں جو میں نے سامنے فریم کرکے رکھی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ تمھاری ساری سمسیائیں کچھ عرصے میں ختم ہوجائیں گی۔'' اس نے اپنے جھولے سے ایک رُدراکش نکالا اور رتی رام کے ہاتھ میں تھما دیا۔ پھر دوبارہ گویا ہوا۔ ''اس کی قیمت ایک سو روپے ہے۔''

رتی رام کو کارڈ پر لکھی ہوئی عبارت سن کر حیرانی ہوئی۔ اسے اپنے بیٹے کی بیماری یاد آئی جس کو تین چار روز سے دست لگے ہوئے تھے اور مقامی وید کی جڑی بوٹیوں سے کچھ افاقہ نہیں ہورہا تھا۔ اس نے اپنا ہاتھ بھی دکھا دیا اور پھر رُدراکش بھی لے لیا اور اس طرح اس کی جیب دوسو روپے سے ہلکی ہوگئی۔ رُدراکش کو اس نے غور سے دیکھا اور پھر آنکھوں سے لگا کر بڑی احتیاط سے اپنی جیب میں رکھ لیا۔ پھر وہ مطمئن ہوکر گھر کی طرف چل پڑا۔ سوچا کہ گھر پہنچتے ہی اپنے کمسن بیٹے کے گلے میں رُدراکش ڈال دوں گا اور پھر اسے تیس کلومیٹر دور ڈسٹرکٹ ہسپتال لے جاؤں گا۔ یہ کیسی متناقض بات ہے کہ اکیسویں صدی ہونے کے باوجود ابھی ہمارے ملک کے دور دراز علاقوں میں مستند طبی سہولیات دستیاب نہیں ہیں جبکہ آئے دن سرکار چاند تو کیا مریخ پر انسان بھیجنے کا دعویٰ

کرتی ہے۔ اکثر و بیشتر گاؤں میں ڈاکٹر ہیں نہ ہسپتال، اسکول ہیں نہ کالج، سیاست دان ہر الیکشن سے پہلے وعدے پروستے ہیں، کبھی غریبی ہٹانے کے اور کبھی کسانوں کی آمدنی دُگنی کرنے کے مگر بعد میں کچھ بھی نہیں ہوتا۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ دیس آج بھی رام بھروسے چل رہا ہے۔

چلتے چلتے اسے یاد آیا کہ ابھی تو ٹھیکے کی رقم بھی چکانی ہے ورنہ ٹھیکے کا مالک آئندہ دارو نہیں دے گا۔ پھر ذہن میں ایک باغی لہر اُٹھی کہ اگر اس نے اس بار ادھار نہیں چکایا تو کون سا آسمان سر پر ٹوٹ پڑے گا۔ اس کو اپنے بیٹے کو ہسپتال بھی تو لے جانا ہے۔ دفعتاً اس کے اندر شراب پینے کی شدید طلب ہوئی اور اسے خود کو روکنا مشکل ہو گیا۔ اندر سے آواز آئی۔ ''آج جانے دو رتی رام، جمنا تو بچوں کی دیکھ بھال کر ہی رہی ہے۔ بیٹے کو مقامی وید کا علاج چل رہا ہے دھیرے دھیرے صحت بحال ہو جائے گی، پھر کیوں خود کو تشنہ رکھو گے۔'' غیر ارادی طور پر اس کے پیر خود بخود ٹھیکے کی طرف اٹھ گئے۔ وہاں پہنچتے ہی اس نے تین سو روپے ٹھیکے کے مالک کے ہاتھ پر رکھ دیے اور ایک بوتل اگلے ہفتے کے حساب میں جوڑنے کے لیے اُدھار مانگ لی۔ پھر ایک گلاس لے کر دُکان کے اندر رکھی کرسی پر بیٹھ کر پینے لگا۔ دکاندار نے ساتھ میں کھانے کے لیے چبینا بھی سامنے میز پر رکھوا دیا۔ بوتل خالی کرنے میں رتی رام کو قریباً آدھا گھنٹہ لگ گیا اور پھر وہ لڑکھڑاتا ہوا اپنی جھونپڑی کی جانب چل پڑا۔ جیب میں صرف دو سو روپے بچے تھے البتہ نشے میں چور وہ آگے بڑھتا جا رہا تھا۔

ابھی اس کے لڑکھڑاتے قدم گھر کے نزدیک پہنچ ہی گئے تھے کہ اس کو بھیڑ کے شور و غل نے استقبال کیا۔ بھیڑ اس کی جھونپڑی کے باہر کھڑی تھی اور سرگوشیاں کر رہی تھی۔ اس نے نظر اٹھا کر دیکھ لیا تو کچھ پولیس والے بھی نظر آئے۔ وہ خود پر قابو نہ رکھ سکا اور دوڑتے بھاگتے جھونپڑی کے اندر گھس گیا۔ سامنے فرش پر پانچ لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ اس کی بیوی، تین بیٹیاں اور ایک بیٹا۔

برسوں سے جمنا اپنی قسمت سے ہر دم جوجھتی رہی تھی مگر آج نہ جانے کیا ہوا اس سے رہا

نہ گیا۔ اس کے کمسن بیٹے نے اس کے سامنے آخری سانس لی تھی کیونکہ وہ اسے ڈسٹرکٹ ہسپتال میں داخل نہیں کرا سکی۔ اس کے پاس اتنا سرمایہ کہاں سے آتا؟ اس کے شوہر کو تو گھر گرہستی کی فکر ہی نہ تھی، جیسے وہ اس کنبے کا فرد ہی نہ ہو۔ تین بیٹیوں کے بعد ایک بیٹا پیدا ہوا تھا اور وہ بھی اب نہیں رہا۔ اسے بیٹے کی موت برداشت نہیں ہوئی۔ شوہر سے تو وہ پہلے ہی بدگماں تھی مگر اب وہ زندگی سے بھی ہار گئی تھی۔ اس نے اپنے اور کھاٹ پر سور ہی اپنی بیٹیوں کے گلے میں رسی ڈال کر چھت پر لٹکتے فین سے رسی باندھ دی اور پھر سوئچ آن کر لیا۔ کچھ ہی لمحوں میں وہ اس دنیا کی جھنجھٹ سے آزاد ہوگئی۔

بھوشیہ وانی کرنے والے کی ساری باتیں بے معنی ہوگئیں اور رتی رام کی جیب میں رُدراکش یوں ہی پڑا رہ گیا۔
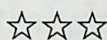
ایک یادگار یاترا

اسے معلوم تھا کہ میں ناستک ہوں، نہ پوجا کرتا ہوں اور نہ ہی مندر جاتا ہوں۔ لیکن کبھی کبھی مجبوری آدمی سے وہ سب کچھ کرواتی ہے جس کو کرنے کی اسے چاہ نہیں ہوتی۔ نوکری کا معاملہ تھا۔ محکمے کا سب سے بڑا افسر دورے پر آیا تھا اور امرناتھ کے درشن کرنا چاہتا تھا۔ تقریباً ۱۳ رہزار فٹ کی اونچائی پر واقع امرناتھ کی گپھا تک پہنچنے کے لیے پہلگام سے آگے چندن واڑی سے ۴۳ رکلومیٹر پیدل چلنا پڑتا ہے۔ ایک دن شیش ناگ تک لگتا ہے، دوسرا دن پنچ ترنی تک اور پھر وہاں سے سیدھا گپھا میں پہنچ جاتے ہیں۔ اس یاترا کے لیے سال میں جولائی - اگست کا ایک مہینہ مختص کیا گیا ہے جب اس متبرک گپھا میں برف کا بنا ہوا شِولنگ اپنی آب وتاب کے ساتھ نظر آتا ہے۔ کہتے ہیں کہ شراون پورنماشی یعنی رکشا بندھن کے دن یہ سب سے اونچا ہوتا ہے۔ دراصل یہ لِنگ موسم کے ساتھ گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔

ہمارے ساتھ آفس کا ایک قافلہ تھا جس کے ذمہ کھانے پینے اور رہنے کا انتظام کرنا تھا۔ سرینگر سے پہلگام، جو کشمیر کا ایک خوبصورت صحت افزا مقام ہے، پہنچنے میں قریباً تین گھنٹے لگے۔ دور افق پر نظر پڑتی تھی تو برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑوں کا سلسلہ دکھائی دیتا تھا جبکہ پیش منظر میں وسیع سرسبز میدان تھے جن کے بیچوں بیچ لِدّر دریا بہہ رہا تھا۔ کہیں کہیں بھیڑ بکری چراتی ہوئی خوبصورت دوشیزائیں نظر آتی تھیں۔ بے نظیر حسن کے پیکر! معصوم، گوری، کتابی چہرا، کشمیری پھرن میں ملبوس، سر کو جہازی رومال سے ڈھکے ہوئے اور کمر پر گندھی ہوئی دو چٹیا ناگن کی طرح بل کھاتی

ہوئیں۔ ریوڑ کو ہانکنے کے لیے ان کے منہ سے طرح طرح کی دلکش آوازیں نکلتی تھیں۔ دل کرتا تھا کہ کہیں بیٹھ کر صرف ان کو دیکھتا رہوں۔ پہلگام کے نزدیک ہی شکارگاہ اور ایک بہت بڑا کولھوئی گلیشر بھی ہے جہاں جانے کے لیے سیاح بے چین رہتے ہیں اور مقامی خچر والے ہمیشہ مستعد۔ میرا افسر کشوری لال اور میں پہلگام ڈاکخانے کا معائنہ کرنے گئے، انھوں نے کچھ ہدایتیں نوٹ کروائیں جو یاترا ختم ہونے کے بعد رپورٹ کی صورت میں متعلقہ دفتروں کو بھیج دی گئیں۔ پھر ہم دونوں سیر سپاٹے میں مصروف ہوگئے۔ رات سرکاری گیسٹ ہاؤس میں بتائی اور دوسری صبح چندن واڑی کی جانب چل پڑے۔

پہلگام سے آگے بیشتر یاتری پیدل ہی سفر کرتے ہیں مگر ہمارے لیے عمدہ خچروں کا انتظام کیا گیا تھا۔ سو ہم دونوں خچروں کی پیٹھ پر بیٹھ کر چندن واڑی کی جانب روانہ ہوگئے۔ لوگوں کا ہجوم جلوس کی صورت میں چلا جارہا تھا جس میں گیروے رنگ کا لباس پہنے ہزاروں سادھو شامل تھے۔ بدن پر راکھ، لمبے جٹادھاری کاکل اور ہاتھوں میں ترشول لیے وہ 'بھولے شنکر کی جے'، 'بابا برفانی کی جے' وغیرہ کے نعرے بلند کررہے تھے۔ گو ہم نے چندن واڑی، شیش ناگ اور پنچ ترنی میں پہلے ہی سے عارضی طور ڈاکخانے کھولے تھے، تاہم ایک خچر کی پیٹھ پر موبائیل ڈاکخانہ بھی کھولا گیا تھا جو ہمارے ساتھ ساتھ ہی چل رہا تھا۔ چلتے پھرتے اس ڈاکخانے کو دیکھ کر یاتریوں کو اچنبھا ہورہا تھا۔ اشتیاقِ تجسس کے لیے وہ چند لفافے، اِن لینڈ لیٹر یا پوسٹ کارڈ خرید کر اسی وقت اپنے رشتہ داروں اور دوستوں کو بھیجتے تھے تاکہ ان پر موسمی ڈاکخانوں یا پھر موبائیل ڈاکخانے کی مہر ثبت ہو جس کی بہت اہمیت ہوتی ہے۔ ہم نے ان چٹھیوں کی اسی روز نکاسی کے پختہ انتظام بھی کیے تھے۔ کشوری لال یہ سب دیکھ کر بڑے خوش ہوئے اور ان ڈاکخانوں کے ملازمین کو شاباشی بھی دی۔ انھوں نے ان ڈاکخانوں کے بارے میں تو سنا تھا مگر پہلی بار ان کا تجربہ حاصل کررہے تھے۔ بہت ہی پرجوش محسوس کررہے تھے۔

شیش ناگ پہنچ کر ہم رات بھر وہیں رکے۔ طعام کا انتظام کیا گیا تھا، سو تناول فرمایا اور

پھر سو گئے ۔ صبح دوبارہ یاترا شروع ہوگئی ۔ راستے میں کشوری لال کی نظر ایک مریل سی دبلی پتلی عورت پر پڑی جو پیدل سفر کر رہی تھی اور جہاں کہیں کوئی پھول ملتا اسے توڑ کر اپنی جھولی میں بھر دیتی ۔ جوں جوں ہم اونچائی چڑھ رہے تھے درجۂ حرارت کم ہوتا جا رہا تھا ۔ ہم نے پہلے ہی سے گرم کپڑے پہن رکھے تھے اس کے باوجود سردی سے ہڈیاں تک کپکپا رہی تھیں ۔ کشوری لال کو تعجب اس بات کا ہو رہا تھا کہ وہ عورت ایک پتلی سی سوتی ساڑھی میں ملبوس تھی اور نہ تھکنے کا نام لے رہی تھی اور نہ ہی ٹھنڈی کا ۔ سچ تو یہ ہے کہ اعتقاد انسان کو مشکل سے مشکل ترین مرحلے طے کراتا ہے ۔ خیر جب ہم گپھا کے نزدیک پہنچ گئے تو اس عورت کے منہ سے چیخ نکلی ۔ '' ہے بھگوان ، دھنیہ ہو ، تم نے اس بے بس عورت کو درشن دے کر کرپا کی ۔ '' دراصل بھگوان نے درشن نہیں دیے تھے بلکہ اس عورت نے کبوتروں کی جوڑی کو اڑتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور وہ سمجھی تھی کہ یہ وہی کبوتروں کی جوڑی ہے جنھوں نے شِو جی کی کتھا سنی تھی اور امر ہو گئے تھے ۔

کشوری لال نے جونہی اس کی آواز سنی تو میری طرف مڑ کر بولے ۔ '' دیکھا کلدیپ ، بھگوان کا کرشمہ ! اس عورت کا لباس دیکھو اور سوچ لو کہ اس کا اعتماد اور عقیدہ کتنا مضبوط ہے کہ وہ بے خوف و خطر یہاں تک پہنچ گئی ۔ یہی وجہ ہے کہ اسے ان امر کبوتروں کے درشن ہو گئے ۔ بھگوان کی کرپا ایسے ہی بھگتوں پر ہوتی ہے ۔ ''

کشوری لال سوچ رہے تھے کہ میں 'یس سر ، یس سر' کروں گا مگر میں نے ایسا نہیں کیا بلکہ جواباً عرض کی ۔ '' سر ، پہلے تو میں یہ نہیں مانتا کہ جو کبوتروں کی جوڑی اس عورت نے دیکھی ہے وہ وہی کبوتر ہیں جو روایت کے مطابق امر ہو چکے ہیں ۔ پھر بھی اگر فرض کر لیں کہ یہ وہی امر کبوتر ہیں جنھوں نے اس عقیدت مند عورت کو درشن دیے لیکن مجھے کیوں دکھائی دیے میں تو ناستک ہوں ؟ ''

وہ خاموش ہو گئے اور بات کو طول دینے کے بجائے کچھ اور مسئلوں پر گفتگو کرنے لگے ۔ میں ثبوت جتانے کی فراق میں بیٹھا تھا تاکہ یہ ثابت کر دوں کہ وہ عورت محض اندھے اعتقاد کی وجہ سے یقین کر بیٹھی ہے ورنہ وہ امر کبوتر نہیں ہیں ۔ دریں اثنا میری نظر کوؤں اور کبوتروں کے غول پر

پڑی جو یاتریوں کے ڈالے ہوئے اناج کے دانوں کو چُگ رہے تھے۔ تعداد سو سے زیادہ تھی۔ میں نے کشوری لال کی توجہ اس طرف مبذول کرائی اور کہا۔ ''سر دیکھ لیجیے وہاں کسی نے اناج کے دانے پھینکے ہیں جس کو کھانے کے لیے بہت سارے کبوتر اور کوّے جمع ہوئے ہیں۔ اب آپ ہی بتائے ان میں سے امر کبوتر کون سے ہیں؟''

''کلدیپ، تم تو پورے ناستک ہو۔ تم کو قائل کرنا بہت مشکل ہے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ اعتقاد ہی زندگی کو سہارتی ہے۔''

''سر، بالکل صحیح کہا آپ نے۔ دنیا کے اکثر و بیشتر انسان صرف عقیدے پر زندہ رہتے ہیں۔''

بات آئی گئی ہوگئی۔ کچھ دیر کے بعد ہم گپھا کے بالکل قریب پہنچ گئے۔ سامنے ایک جھرنا بہہ رہی تھی جس میں سبھی شردھالوؤں نے ڈبکی ماری اور پھر صاف کپڑے پہن کر اندر گپھا میں درشن کرنے کے لیے چلے گئے۔ گپھا میں پوجا کرنے اور شِو لِنگ کے درشن کرنے کے بعد ہم واپس چل پڑے۔ واپسی میں چونکہ زیادہ تر اُترائی تھی اس لیے چڑھنے کے مقابلے میں بہت کم وقت لگا۔ شیش ناگ پہنچتے ہی ہم نے دیکھا کہ ایک بھیڑ سی جمع ہو چکی ہے اور بھیڑ میں سبھی یاتری کہہ رہے تھے کہ انھیں شیش ناگ کے درشن ہو گئے۔ کشوری لال سے رہا نہ گیا۔ اس نے جلدی سے اپنی دور بین نکالی اور جھیل کی اس طرف دیکھا جہاں بقول یاتریوں کے ایک چھ منہ والا سانپ دکھائی دے رہا تھا۔ جہاں یاتری کھڑے تھے اور جھیل کی سطح کے درمیان کئی سو میٹر کا فاصلہ تھا۔ دور بین سے کشوری لال کو سانپ کی مانند کچھ منحنی سی متحرک لکیر نظر آئی۔ انھوں نے جلدی سے طے کر لیا کہ ہو نہ ہو یہ وہی شیش ناگ ہے جس کے بارے میں کتابوں میں پڑھتے آئے ہیں۔ خوب اطمینان کر کے انھوں نے مجھ سے کہا۔ ''لو ناستک جی، آپ بھی شیش ناگ کے درشن کر لو اور بتاؤ کہ وہ شیش ناگ ہے یا نہیں؟''

میں نے ان سے دور بین مانگ لی اور اس طرف غور سے دیکھا جہاں شیش ناگ ہونے کا

دعویٰ کیا جا رہا تھا۔ مجھے تو کہیں کچھ نظر نہیں آیا، صرف جھیل کے پانی پر سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی لہر دکھائی دی جو ایک طرف دھوپ پڑنے کے سبب دوسری طرف سے کالی نظر آ رہی تھی۔ میں بڑی انکساری کے ساتھ کشوری لال سے مخاطب ہوا۔ ''سر آپ یہ سوال بحیثیت ممبر پوسٹل بورڈ کر رہے ہیں یا بحیثیت ہم سفر کے؟''

''کیوں، ایسا کیوں پوچھتے ہو؟'' انھوں نے جواب دیا۔

''سر شاید آپ نے وہ انگریزی کہانی پڑھی ہوگی 'دی ایمپریرس نیو کلودس'۔ اس لیے پوچھ رہا ہوں۔''

میں نے وہ کہانی بچپن میں پڑھی تھی۔ دو چور ایک بادشاہ کے سامنے حاضر ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ سونے کی تار سے ایک ایسا کپڑا بُنتے ہیں جو صرف انہی لوگوں کو دکھائی دیتا ہے جنھوں نے زندگی میں کبھی رشوت نہ لی ہو۔ بادشاہ ان کی باتوں میں آ جاتا ہے اور انھیں جتنا سونا چاہیے اتنا دلوا دیتا ہے۔ بہت عرصہ بعد دونوں چور بادشاہ کو ایک کمرے میں بے لباس کرتے ہیں اور اس پر ایسے ہاتھ پھیرتے ہیں جیسے کہ وہ اسے کپڑے پہنا رہے ہوں۔ بعد میں بادشاہ کو شاہانہ جلوس میں لے جایا جاتا ہے۔ درباریوں اور سڑک کی دونوں طرف کھڑے تماشائیوں کو بادشاہ کی عریانی صاف نظر آتی ہے مگر کوئی اس کو ننگا کہنے کی ہمت نہیں جُٹا پاتا ہے تاکہ اس پر راشی ہونے کا الزام نہ لگایا جائے۔ البتہ ایک عورت کی گود میں ننھا منا بچہ دفعتاً چلاّتا ہے کہ بادشاہ تو ننگا ہے۔ اس کے کہنے کے ترنت بعد ہر طرف چہ میگوئیاں شروع ہونے لگتی ہیں کہ بادشاہ تو حقیقت میں ننگا ہے۔ بادشاہ کو بھی اپنے ننگے پن کا احساس ہوتا ہے۔ نتیجے میں دونوں چوروں کو قید کر لیا جاتا ہے۔

کچھ وقفے کے بعد میں پھر گویا ہوا۔ ''سر اگر آپ بحیثیت ممبر پوچھ رہے ہیں تو وہ شیش ناگ ہی ہے اور اگر آپ بطور ہم سفر کے پوچھ رہے ہیں تو وہاں پر کچھ بھی نہیں ہے۔''

کشوری لال میری بات سمجھ گئے۔ وہ ہنس دیے اور کہنے لگے ''کلدیپ اس بارے میں تمھیں قائل کرنا میرے بس کی بات نہیں ہے۔'' آخر کار ہم پہلگام پہنچ گئے جہاں چائے ناشتہ

کر کے ہم سیدھے سرینگر روانہ ہو گئے۔ ☆☆☆

فردِ تعلیقہ

کیپٹن سبرامنیم کی شخصیت پر مجھے ہمیشہ حیرانی ہوتی تھی۔ گوہاٹی ایئر فورس پوسٹل یونٹ کا آفسر کمانڈنگ تھا۔ انتظام کے معاملے میں اس کا یونٹ مقامی ایئر فورس فارمیشن کے ماتحت تھا مگر تکنیکی طور پر وہ میرے ماتحت کام کرتا تھا۔ میں ان دنوں شیلانگ میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر آرمی پوسٹل سروسز کے عہدے پر فائز تھا۔ سبرامنیم کی تکنیکی صلاحیت کے بارے میں مجھے ہمیشہ شک وشبہ رہا کیونکہ اس کا بیک گراونڈ ہی کچھ ایسا تھا۔ پوسٹ آفس میں کبھی کام کیا ہی نہیں، سرکل آفس میں بطور یوڈی سی جوائن کر لیا، پھر آرمی پوسٹل سروس میں ڈیپوٹیشن پر جانے کی درخواست دی، وہاں جا کر جونئیر اکاونٹس آفسر کا رعایتی امتحان پاس کیا اور لیفٹننٹ بن گیا۔ بعد میں پروموشن پا کر کیپٹن ہو گیا اور گوہاٹی میں تعینات ہوا۔ غرض چند برسوں میں اس کی زندگی بدل گئی۔

گھر میں ایک فربہ بدن بیوی تھی اور تین چھوٹے بچے تھے جو زیادہ تر ننگے پاؤں ہی دیکھے جا سکتے تھے۔ دھول مٹی میں اٹے ہوئے بال اور ناک سے بہتی ہوئی رینٹ، ان کا کوئی پرسان حال نہیں تھا۔ بیوی افسر سے زیادہ کسی سپاہی کی زوجہ لگ رہی تھی۔ چاروں خدا کے بھروسے جی رہے تھے کیونکہ سبرامنیم انھیں گھاس بھی نہیں ڈالتا تھا۔ اپنی بیوی میں اس کی دلچسپی بہت عرصہ پہلے ختم ہو چکی تھی اور بچے تو ایسے چوزے تھے جو جہاں ماں جاتی تھی وہاں اس کے پیچھے پیچھے ہو لیتے۔

بدنما چہرا ہونے کے باوجود نہ جانے کیپٹن سبرامنیم کے بدن سے ایسی کون سی مُشک نکلتی

تھی کہ خوبصورت عورتیں اس کی دیوانی ہو جاتیں۔ جیسے کوئی کہربا چھوٹے چھوٹے تنکوں کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے ویسے ہی وہ حسیناؤں کو اپنی مقناطیسی شخصیت سے متاثر کرتا تھا۔ گھر سے باہر وہ کئی رومانس لڑاتا تھا پھر باہر جمع کی ہوئی تپن کو گھر آ کر منتظر بیوی کے کوڑے دان نما جسم میں انڈیل دیتا۔ تین بچوں نے اسی کوڑے دان سے جنم لیا تھا۔ اگر کوئی اسے پوچھتا کہ تمھاری بیوی کی شکل و صورت کیسی ہے یا پھر تمھیں اپنی بیوی کے بدن میں کونسا انگ سب سے پیارا لگتا ہے شاید ہی وہ کہہ پاتا کیونکہ سبر امنیم نے اس کی طرف کبھی دھیان ہی نہیں دیا۔ دونوں بستر میں ایک ساتھ سوتے، اپنی بدن کی گرمی کو ایک دوسرے کے ساتھ ساجھا کرتے لیکن اس وقت بھی سبر امنیم کی آنکھوں میں اس کی محبوباؤں کے پیکر گھومتے تھے اور وہ ان ہی کے خیالوں میں گُم رہتا۔

دھیرے دھیرے اس کی بیوی کو اس کی حرکتوں کا اندازہ ہونے لگا۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اپنے سوامی کو کیسے رجھائے، کیسے اپنے سرمئی بدن کی جانب اسے متوجہ کرے، تین زچگیوں کے سبب بدن ڈھیلا پڑ چکا تھا پھر بھی اس میں زندگی کی تھوڑی بہت رمق تو باقی تھی۔ رشتے جوں جوں سرد پڑتے گئے اتنی ہی وہ متجسس ہوتی چلی گئی کہ آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ اس کے بدن کا مالک اسے بدظن ہو رہا ہے؟ آہستہ آہستہ اس پر یہ راز آشکار ہو ہی گیا کہ اس کا شوہر بھنورا بن چکا ہے اور ڈال ڈال پھدک کر اپنی غذا ڈھونڈتا پھرتا ہے۔ اسی گھٹن نے اس کو ذہنی اختلال میں مبتلا کر دیا۔ کئی بار مجھے سننے میں آیا کہ وہ ننگے پاؤں اپنے بچوں کو ساتھ لے کر مقامی فارمیشن کے اعلیٰ افسروں کے سامنے گوہار لگانے جاتی اور افسر کیپٹن سبر امنیم کو بلوا کر سرزنش کرتے۔ اس کے باوجود اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ حالت اتنی گھمبیر ہوگئی کہ پاس پڑوس کے لوگوں نے اس کنبے ہی سے ناتا توڑ دیا اور مسز سبر امنیم کی تنہائیاں اور بھی خوفناک ہوگئیں۔ وہ چھٹپٹاتی اور تڑپتی جبکہ اس کے بچے پاس پڑوس کے بچوں کے ساتھ کھیلنے کودنے کے لیے ترستے۔

بہر حال کیپٹن سبر امنیم ٹس سے مس نہ ہوا۔ ایک کان سنتا اور دوسرے کان چھوڑ دیتا۔ وہ اپنی ہی دھن میں مست چلا جا رہا تھا۔ کبھی ایک نرسنگ افسر کے ساتھ اور کبھی دوسری کے ساتھ،

کبھی سِولین سیلز وومن کے ساتھ اور کبھی کسی ایئر ہوسٹس کے ساتھ۔ مجھے کیپٹن سبرامنیم کی ان فتوحات کی خبر ملتی رہتی اور میں دل ہی دل میں اس سے نفرت کرتا اور شاید رشک بھی۔ وہ ایسا جانباز تھا جو اپنی زندگی، عزت اور خوشحالی کو داؤ پر لگا کر آگے ہی آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔

ایک روز ایسٹرن کمانڈ کولکتہ میں اسے میری ملاقات ہوئی۔ وہاں پر اس کا یونٹ تھا اس لیے ان کی گاڑی استعمال کر سکتا تھا۔ مجھے اس کی گاڑی کی ضرورت پڑی۔ وہ گاڑی میں خود بھی میرے ہمراہ ہولیا۔ مجھے نرسنگ سروس آفسرس میس میں ایک دوست کی بہن سے ملنا تھا۔ وہ میرا انتظار کر رہی تھی۔ جب تک میں کیپٹن سرشٹی کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف رہا تب تک اس نے میس میں ایک نرسنگ آفسر کو پٹالیا اور اس سے ملنے کا ٹائم بھی مقرر کر لیا۔ اتنا ہی نہیں، جاتے جاتے اس نے میرا تعارف بھی کرایا۔

بہت عرصے کے بعد مجھے اطلاع ملی کہ بہار میں اس کے ماتحت ایک فیلڈ پوسٹ آفس میں دو لاکھ روپے کا غبن ہوا ہے اور اس کا فیلڈ پوسٹ ماسٹر وارنٹ افسر ارجن دیو فرار ہے۔ خبر ملتے ہی میں نے کیپٹن سبرامنیم کو ٹیلی فون پر معاملے کے بارے میں پوچھا تو جواب ملا۔

''سر، مجھے بھی آج صبح ہی یہ خبر ملی۔ وہاں ڈاک خانہ تین دن سے بند پڑا ہے۔ فارمیشن کے لوگ جن کے کھاتے فیلڈ پوسٹ آفس میں ہیں، وہ بہت پریشان ہیں۔ سر میں آج رات کی گاڑی سے وہاں جا رہا ہوں۔ دو تین روز تک آپ کو ساری جانکاری دوں گا۔''

چار روز کے بعد وہ میرے پاس آیا اور اپنی رپورٹ سامنے رکھ دی۔ اس کی برانگیختگی دیکھ کر مجھے حیرت ہو رہی تھی جیسے کوئی قلعہ فتح کر کے آیا ہو۔ وہ اس لیے خوش نہیں تھا کہ اس نے مجرم کو پکڑ لیا تھا یا پھر وہ ساری رقم مجرم سے وصول کر لی تھی جو دست برد ہو چکی تھی۔ بلکہ وہ اس لیے خوش تھا کہ اس نے مجرم کے گھر کی تلاشی لی تھی اور عجیب و غریب فرد تعلیقہ بنائی تھی۔

ارجن دیو کا کہیں کوئی اتا پتا معلوم نہ ہوا۔ پولیس میں رپورٹ درج ہو گئی تھی اور اس کے گاؤں میں اس کی تلاش شروع ہوئی تھی۔ حیرانی کی بات تو یہ تھی کہ ان بچت کھاتوں میں کئی سالوں

سے یہ خورد بُرد ہو رہی تھی اور کیپٹن سبرامنیم نے اس دوران کئی بار اس فیلڈ پوسٹ آفس کا معائنہ کیا تھا مگر وہ اس فراڈ کو پکڑنے میں ناکام رہا تھا۔ پکڑتا بھی کیسے، اس کا دھیان تو کہیں اور ہی رہا ہوگا اور ارجن دیو نے اس کی خوب سیوا کی ہوگی۔ وہ جب بھی انسپکشن کے لیے جاتا تو شراب اور شباب کی پارٹیوں میں شریک ہو جاتا۔ پھر سرسری طور پر انسپکشن کر کے واپس چلا آتا۔

ارجن دیو کے کوارٹر کو کھلوایا گیا، ایک کمیٹی نے اس کے گھریلو سامان کی فہرست بنالی اور اس کو اپنی تحویل میں لیا۔ کیپٹن سبرامنیم بھی اس کمیٹی کا ممبر تھا۔ چنانچہ وارنٹ افسر ارجن دیو نے اپنی فیملی گاؤں ہی میں رکھی تھی اور کبھی کبھار انھیں وہاں پر لے آتا تھا اس لیے فیملی کا کوئی زیادہ سامان برآمد نہیں ہوا۔ البتہ فرد تعلیقہ پڑھ کر مجھے حیرت ہوئی۔ سامان کی لسٹ میں کئی ایسی چیزیں تھیں جو ارجن دیو کی کارکردگی کو ظاہر کرتی تھی مثلاً لیڈیز براز یرس ۱۰ رعدد، لیڈیز پینٹیز ۱۲ رعدد، امپورٹڈ کنڈوم ۱۵ رپیکٹ، شراب ۸ ربوتلیں اور لیڈیز ساز و سنگار کا سامان ۲ رکارٹن۔ دراصل ارجن دیو نے اپنے گھر کو رنگ رلیوں کا اڈّا بنایا تھا اور اس کے سبھی دوست وہاں پر مل کر عیش کرتے تھے۔ عورتیں لائی جاتیں، جام پر جام پیئے جاتے، ڈانس پارٹیاں ہوتیں اور رات بھر ان کے ساتھ موج مستی ہوتی۔ مذکورہ چیزیں یا تو استعمال ہوتیں یا پھر ان کو بطور تحفہ دی جاتیں۔

غبن کی رقم وصول کرنے میں کیپٹن سبرامنیم ناکام رہا۔ البتہ جن لوگوں نے روپیہ جمع کیا تھا جانچ کر کے ان کے کھاتے میں روپیہ جمع کیا گیا اور سارا خسارہ سرکار کو اٹھانا پڑا۔

وارنٹ افسر ارجن دیو اب بھی فرار ہے اور پولیس اس کو تلاش کرنے میں اب تک ناکام رہی ہے۔

کیپٹن سبرامنیم آج بھی اپنی خرمستیوں میں مست ہے اور اپنی پرموشن کا انتظار کر رہا ہے۔

☆☆☆

سونٹے

میرے لیے چھڑی سے سونٹے تک کا سفر بہت ہی دردناک رہا ہے۔ آج بھی جب میں اس کے بارے میں سوچتا ہوں تو سارے بدن میں جھرجھریاں پیدا ہوتی ہیں۔ بہت کم خوش نصیب انسان ہوتے ہیں جنھیں بچپن میں چھڑی سے واسطہ نہیں پڑتا۔ البتہ کئی بچے ایسے بھی ہوتے ہیں جو کمسنی میں ہی چھڑی کے مختلف اقسام جیسے ڈنڈے اور سونٹے سے خوگر ہوجاتے ہیں۔ یہ چھڑی کی ارتقائی منزلیں ہیں، فرق صرف موٹائی اور قطر کا ہوتا ہے۔ عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ جب چھڑی سے کام نہیں چلتا ہے تو ڈنڈے سے کام لیا جاتا ہے اور پھر جب وہ بھی بےکار ثابت ہوتا ہے تو سونٹے سے بدن پر نقش ونگار کیے جاتے ہیں۔ کئی بچے جوان تینوں مرحلوں سے بخوبی گزر جاتے ہیں عام طور پر کچھ وقت سلاخوں کے پیچھے گزارتے ہیں۔ ان میں سے کچھ سیاسی رہنما بن جاتے ہیں اور کچھ سیاست دانوں کے لیے کام کرنے والے گرگے۔ ایسے لوگوں کا مستقبل حد سے زیادہ روشن ہوتا ہے۔

مجھے یاد ہے کہ چھڑی سے میری ملاقات بچپن میں ہوئی تھی۔ رات کو جب میرے پتاجی تھکے ماندے کام سے لوٹ کر گھر آتے تو ماتاجی یا گھر کے دوسرے بزرگ میرے خلاف کان بھرلیتے جس کے بعد ان کا غیظ وغضب دیکھنے لائق ہوتا۔ دراصل وہ اس وقت آرام اور سکون کی تلاش میں ہوتے تھے مگر اس کے بدلے انھیں یہ سب باتیں سننا پڑتیں اس لیے وہ اپنے غصے پر قابو پانے میں ناکام رہ جاتے۔ پتاجی مجھ سے جواب طلبی کیے بغیر کہیں سے کوئی چھڑی ڈھونڈ کرلاتے

اور میرے بدن پر نقش ونگار کرتے ۔ بات چاہے کچھ بھی ہوتی ، ان کی چھڑی کا رقص تھمنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ چھڑی زیادہ موٹی نہیں ہوتی تھی مگر اس میں بید کی سی لچک ہوتی اور جب بدن پر پڑتی تو چنگاریاں پیدا کرتی ۔ میں اچھلتا ، کودتا ، چلاّ تا ، قلا بازیاں کھاتا اور روتے روتے آسماں سر پر اٹھا لیتا مگر کیا مجال پتا جی پر کوئی اثر ہو جاتا۔ اکثر و بیشتر والدہ یہ کہتے ہوئے سنائی دیتی:

''آج دن بھر اس بندے نے گھر میں قدم بھی نہ رکھا، صبح کا نکلا ہے اور ابھی آپ کے آنے سے پہلے گھر میں داخل ہوا ہے۔ کھانے کی فکر نہ پڑھنے لکھنے کی فکر ، اس کو تو صبح سے شام تک صرف کرکٹ کھیلنے کا چسکا لگا رہتا ہے۔ نہ جانے کس مٹی کا بنا ہوا ہے۔''

اب بھلا بتائیے کہ پتا جی تو کام پر صبح کے نکل جاتے تھے ، دن بھر محنت مزدوری کر کے پسینے میں شرابور رات کو لوٹ آتے ، یہ سب کچھ سننے سے تلملا نہ جاتے تو پھر کیا کرتے ۔ نہ جانے میرے بارے میں کیا کیا سپنے سنجوئے تھے انھوں نے ۔ آدمی سوچتا ہے کہ گھر بار کے لیے دن بھر کام کرتا ہوں ، لوگوں کا بُرا بھلا سنتا ہوں ، سوچتا ہوں کہ گھر پہنچوں گا تو وہاں آرام ملے گا ، بیوی گرم گرم کھانا پروسے گی ، بچے خوشی خوشی ارد گرد جمع ہوں گے اور اپنے دن بھر کے کام کا بیورا دیں گے ۔ مگر یہاں تو الٹی ہی گنگا بہتی تھی ۔ ابھی گھر میں قدم رکھا ہی نہیں ہوتا کہ میرے خلاف شکایتوں کا انبار لگ جاتا ۔ آج دن بھر گھر میں قدم نہیں رکھا۔ پڑوسی کے بیٹے بنٹی سے جھگڑا کیا اور اس کو چوٹ لگائی ۔ آنگن میں کرکٹ کھیلتے کھیلتے پڑوسیوں کے دو شیشے توڑ دیے ۔ یہ سب سن کر پتا جی کو کہاں چین آ جاتا ، آؤ دیکھتے نہ تاؤ ۔ کہیں سے چھڑی برآمد کرتے اور مجھے تب تک پیٹتے رہتے جب تک ماتا جی کھانا نہ پروستی ۔ ممکن ہے کہ ماتا جی کو دل میں درد کی کہیں کوئی ٹیس اٹھتی ہو مگر باہر سے ایسا منہ بنا لیتی جیسے خوش ہو رہی تھیں ۔ بڑی بہن تو اشاروں اشاروں میں کہتی کہ دیکھا مجھ کو تنگ کرنے کا انجام کیا ہوتا ہے ۔ اور میں درد کا مارا ، روتے روتے بے حال ہو جاتا ، کھانا کھانے سے انکار کر دیتا اور پھر نہ جانے کس وقت میری آنکھ لگ جاتی اور بھوکا ہی سو جاتا ۔

البتہ ماں رات بھر سو نہیں پاتی تھی ، صبح سویرے ہی میرے لیے لذیذ ناشتہ بنا کر سامنے

رکھ دیتی جس کو میں جلدی سے زہر مار کر لیتا اور کل رات کا واقع یکسر بھول جاتا۔ پتا جی چھڑی کو پھر اپنی جگہ پر رکھ لیتے اور اگلے اپی سوڑ کا انتظار کرتے۔ بچپن کی اس بے سبب پٹائی کی وجہ سے میں نہ تو کرکٹ پر فوکس کر سکا گو مجھے اس میں خاصی دلچسپی تھی اور نہ پڑھائی کے معاملے میں کوئی اعلیٰ ڈگری حاصل کر سکا کیونکہ پڑھائی میں میری کوئی دلچسپی نہ تھی۔

ان دنوں کرکٹ میں زیادہ پیسہ نہیں ملتا تھا اس لیے والدین بچوں کو کرکٹ کھیلنے میں فضول وقت ضائع کرنے سے روکتے تھے۔ انھیں کیا معلوم تھا کہ ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ کرکٹر سیلی برٹی بن جائیں گے، ان کے پاس دو تین سو کروڑ کے گھر ہوں گے اور ان کے گیراج میں ایک سے بڑھ کر ایک بیسیوں موٹر سائیکلیں قطار میں کھڑی ہوں گی۔ ان دنوں تو کرکٹر ہونا ایک شاپ تھا، کسی کو کوئی خطرناک بیماری لاحق ہو جاتی تو اس کے لیے مناسب سرمایہ میسر نہ ہوتا۔

خیر پتا جی کی چھڑی اور ماتا جی کی چغلی نے مجھے کرکٹر بننے سے باز رکھا اور اس طرح ہندوستان کو ایک اور سچن تیندولکر یا دھونی ملنے سے رہا۔

اسکول میں ہر استاد کے پاس ایک چھڑی ہوتی تھی جس سے وہ کلاس کو چپ کراتا تھا ۔صرف ایک ڈرِل ماسٹر تھا جس کے پاس ایک مخصوص قسم کی چھڑی ہوتی تھی جس کو وہ 'کین' کہتا تھا ۔ وہ ڈرِل، مارچ پاسٹ اور بینڈ کا ماہر تھا۔ این سی سی کی پریڈ بھی کراتا تھا۔ پڑھانا وڑھانا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ یہ کین اور کیپٹن کی رینک اس کو این سی سی کی بدولت ملے تھے۔ کین زیادہ لمبا نہیں تھا، ایک میٹر سے کم ہی تھا، ایک سرے پر موٹھ تھی جو دھات کی بنی ہوئی تھی اور ہمیشہ چمکتی رہتی تھی۔ اسی کو پکڑ کر وہ بچوں پر اپنا رعب جماتا تھا۔ ایک روز ہماری کلاس تفریح کے لیے نزدیکی پہاڑی مقام پر چلی گئی۔ ایک طالب علم نے اپنے ساتھ سگریٹ کا پیکٹ لایا تھا۔ شکل وصورت سے وہ بہت ہی شریف معلوم ہوتا تھا اس لیے مجھے اس کا یہ فعل دیکھ کر بڑا تعجب ہوا۔ ہم جماعت ہونے کی وجہ سے میں نے زیادہ پوچھ تاچھ نہیں کی۔ لنچ کرنے کے بعد ہم چار طالب علم گھنے درختوں کی اوٹ میں چھپ گئے اور ایک کے بعد ایک سگریٹ پھونکتے رہے۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ کس نے ہمیں

ایسا کرتے ہوئے دیکھا اور ہماری مخبری کی۔ پھر کیا تھا۔ دوسرے روز دعائیہ مجلس کے بعد ہیڈ ماسٹر صاحب نے سگریٹ نوشی کے بُرے نتائج پر لمبا چوڑا لیکچر دیا۔ تقریر ختم ہونے کے بعد ڈرل ماسٹر نے ان چاروں طالب علموں کے نام لیے جنھوں نے ایک روز پہلے ایکسکرشن کے دوران سگریٹ نوشی کی تھی۔ سبھی کو سامنے کھڑا کر دیا گیا اور پھر کین سے خوب پٹائی کی گئی۔ ڈرل ماسٹر اپنے کین کو 'عقل نما' کہتا تھا۔ اس کا ماننا تھا کہ کین کی مار کھا کر بچے کی عقل آ جاتی ہے اور وہ اچھے اور برے کام میں تمیز کرنا سیکھ جاتا ہے۔ مار کھا کر میرے جسم خاص کر بانہوں اور کمر پر نیل پڑ گئے۔ تاہم اسکول میں جو ہوا سو ہوا، میرے ایک کزن نے، جو اسی اسکول میں مجھ سے دو کلاس جونیئر تھا، یہ خبر گھر تک پہنچا دی اور وہاں پتا جی کے ڈنڈے نے باقی ماندہ کام کیا۔ غرض تین چار دن میں کراہتا رہا اور گھر سے باہر نہیں نکل سکا۔ اسکول جانا تو ممکن ہی نہ تھا، وہاں دوستوں کو کیسے منہ دکھاتا۔ خیر آہستہ آہستہ زخم مندمل ہو گئے اور ایک ہفتے کے بعد میں پھر سے اسکول جانے لگا۔ 'عقل نما' میری عقل سدھارنے میں ناکام رہا اور اس واقعے کے بعد سگریٹ نوشی میری عادت بن گئی۔

چھڑی کیسے جوان ہو گئی اور ڈنڈا بن گئی، اس کا تو مجھے گمان بھی نہ تھا۔ صرف اتنا یاد ہے کہ میٹرک کے امتحان کا نتیجہ نکلا اور میں تھرڈ ڈویژن میں پاس ہو گیا۔ گھر میں سبھی برہم بیٹھے تھے۔ پتا جی غصے کے مارے آپے سے باہر ہو رہے تھے۔ انھوں نے نہ جانے کہاں سے ایک موٹا سا ڈنڈا لایا اور مجھے اس سے مارنے لگے۔ زندگی میں پہلی بار اتنے موٹے ڈنڈے کی مار کھا رہا تھا۔ بہت رویا، چلّایا اور چیخا مگر کسی کے کان پر جوں نہ رینگی۔ پھر مجھ سے رہا نہ گیا۔ روتے روتے ہی پتا جی سے سوال کر بیٹھا۔

''آپ کیوں مجھے اس ڈنڈے سے مار رہے ہیں؟''

''یہ عقل نما ہے۔ تم جیسے شریر بچوں کو ہوش میں لانے کے لیے بہت ضروری ہے۔ اس کی بدولت تم آگے محنت کرو گے اور مستقبل میں اچھے نمبر لاؤ گے۔ تمھیں اس کی اشد ضرورت ہے۔''

''اوہ پاپا۔ میرے بدن پر کیا گزری ہے اس کا اندازہ آپ نہیں لگا سکتے۔ آپ بھی تو

میٹرک میں تھرڈ ڈویژن لے کر پاس ہوئے تھے۔آپ کے پتاجی نے بھی تو مایوس ہوکر آپ کی پٹائی کی ہوگی مگر کیا حاصل ہوا؟ سال بھر کالج گئے اور پھر پڑھائی چھوڑ کر نوکری کرنے لگے۔شکر کیجیے کہ ماماجی کی سفارش سے پرائیویٹ بنک میں نوکری ملی تھی ورنہ.....! آپ کے کیس میں تو یہ عقل نما بھی فیل ہوا تھا۔''

''بیٹے اب تو حالات بدل چکے ہیں۔اب کمپیٹیشن کا زمانہ ہے۔نوکریاں کہاں ملتی ہیں۔تھرڈ ڈویژن والوں کو کالج میں ایڈمشن ملنا بھی مشکل ہوجاتا ہے۔تم نے تو میری ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔میری تمنّا تھی کہ تم پڑھ لکھ کر ایک بہت بڑے افسر بن جاؤ گے۔سماج میں عزت پاؤ گے اور ہماری مالی حالت سدھر جائے گی۔مگر تم مٹر گشتی کرتے رہے، میرے ارمانوں کا کبھی خیال نہیں کیا اور بار بار سمجھانے کے باوجود ٹس سے مس نہ ہوئے۔''

''پتاجی، یہی حال آپ کے پتاجی کا بھی ہوا ہوگا۔انھوں نے آپ کے بارے میں نہ جانے کتنے خواب پالے ہوں گے۔سوچا ہوگا کہ لڑکا بڑا ہوکر خاندان کا نام روشن کرے گا۔مگر آپ میٹرک کے آگے چل ہی نہ پائے۔جب آپ نے اپنے پتاجی کی امیدوں پر پانی پھیر دیا تو پھر مجھ سے ایسی امیدیں کیوں لگا رکھی ہیں؟ اپنی قابلیت کے مطابق مجھ سے جتنی محنت ہو پاتی ہے اتنی کرتا ہوں، نہ جانے کیوں ممتحنین کو میرے جوابات پسند نہیں آتے؟''

جواب سن کر پتاجی کے ڈنڈے پر فالج گر گیا اور اس نے تھرکنا بند کر دیا۔وہ دن اور آج کا دن میرے بدن پر پتاجی کا ڈنڈا کبھی نہیں پڑا۔مگر میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس کے بعد میں ڈنڈے سے آزاد ہوگیا۔بالکل نہیں۔کالج میں ایک دن فلم دیکھنے کا موڈ بنا اور میں کلاس چھوڑ کر سینما گھر پہنچ گیا۔احمری چوک میں واقع سب سے پرانے سینما ہال میں دلیپ کمار کا فلم چل رہا تھا۔لوگ دیوانے ہو رہے تھے حالانکہ فلم کو لگے ہوئے پورے چھ ہفتے گزر چکے تھے لیکن بھیڑ تھمنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔خیر میں بھی لائن میں کھڑا ہوگیا مگر دل مان نہیں رہا تھا کہ ٹکٹ مل جائے گی۔قطار میں جو لوگ کھڑے تھے وہ دھکا پیلی کر رہے تھے جس سے قطار کئی بار منحنی ہوجاتی۔پھر ایک ریلا آجاتا

اور کچھ لوگ قطار سے باہر ہو جاتے اور انھیں واپس اپنی جگہ نہیں مل پاتی تھی۔ سینما ہال میں چند پولیس والے تعینات تھے مگر وہ محض تماشائی بنے بیٹھے تھے۔ ہر طرف شور شرابا ہو رہا تھا۔ اسی شور کے درمیان کانوں میں کالا بازاریوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ بالکونی دس، ڈریس سرکل سات ..... ڈریس سرکل سات، بالکونی دس....! دل میں خیال آتا کہ ان ہی سے ٹکٹ خرید لوں اور ہال کے اندر چلا جاؤں مگر حوصلہ کہہ رہا تھا کہ کوشش کرنے میں کیا ہرج ہے، اگر نہیں ملے گی تو پھر بلیک میں خرید لیں گے۔ سینما ہال کے مالک نے ان قطاروں کو قابو میں رکھنے کا کام ایک تند خو آدمی کو سونپ دیا تھا جس کا نام تھا جبّار شہدا۔ کسرتی بدن، رنگ سیاہ مائل، چیچک زدہ چہرہ، اور گھنی مونچھیں جو اس کے چہرے کو اور بھی خوفناک بناتی تھیں۔ وہ اکیلے ہی مختلف قطاروں میں نظم و ضبط پیدا کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ کسی نے مجھے بتایا کہ جبّار شہدا بہت عرصہ پہلے بلیکر ہوا کرتا تھا، پھر اس نے کچھ نوجوانوں کو اس کام کے لیے مامور کر لیا اور خود ترقی پا کر ان کا سرغنہ بن بیٹھا۔ سینما گھر کے سبھی ٹکٹ بیچنے والوں سے اس کی سازباز تھی۔ اس کے لیے تیس فیصد ٹکٹیں پہلے ہی سے مختص ہوتیں جن کو جبّار اپنے حواریوں میں بانٹتا تھا۔ ان پر کمائے ہوئے نفع میں سے وہ اپنا حصہ الگ نکال کر شاگردوں میں تقسیم کر لیتا تھا۔ جب سے کالا بازاری کی آمدنی یقینی بن گئی، سینما گھر کے مالکان نے اسے سینما ہال کی بھیڑ کو قابو میں رکھنے کے لیے تعینات کیا اور اس کے لیے معقول معاوضہ بھی دینے لگے۔ اس روز جب وہ ہماری قطار کے پاس پہنچا، اسی وقت نہ جانے کہاں سے ایک ریلا سا آگیا اور لائن سانپ کی طرح بل کھانے لگی۔ پیچھے سے دھکا پیل کی وجہ سے درمیان میں کھڑے شریف اور کمزور لوگ قطار سے باہر پھینک دیے گئے اور قطار میں انھیں اب کوئی جگہ نہیں دے رہا تھا۔ میرے لیے تو یہ نیا تجربہ تھا۔ کہاں تو میں نے سوچا تھا کہ پانچ چھ منٹ کے بعد میں ٹکٹ گھر کی کھڑکی کے پاس کھڑا ہو جاؤں گا اور کہاں تو میں لائن سے باہر ہو گیا اور واپس لائن میں گھسنے کی کوشش کرنے لگا مگر لائن میں کھڑے لوگ احتجاجاً شور مچانے لگے اور مجھے بیچ میں گھسنے سے روکنے لگے۔ اسی شور و غل میں میری کمر پر جبّار شہدا کے دو تین سونٹے پڑ گئے اور میں لڑھکتا ہوا زمین پر گر گیا۔ بھیڑ میں کسی کو کوئی

فرق نہیں پڑا۔ سبھی اپنا مقام برقرار رکھنے کی تاک میں تھے۔ کچھ وقفے کے بعد پولیس کے دو سپاہی آئے اور انھوں نے مجھے فرش پر کراہتے ہوئے دیکھ کر مجھ پر ترس کھایا، مجھے سہارا دے کر کھڑا کر دیا اور سامنے ایک دوا فروش کی دکان پر میرے زخموں پر مرہم لگوائی۔ دکان دار نے میرے لیے دودھ کا ایک گلاس منگوایا اور مجھے پینے کو دیا۔ پھر اس نے مجھ پر رحم کھا کر گھر بھیج دیا۔ انجام کار میں کالج سے بھی گیا اور فلم سے بھی۔

ملازمت کے بعد بھی سونٹوں سے میرا ناتا برقرار رہا۔ میری تقرری ایک سکول میں بحیثیت استاد کے ہوئی۔ چند سال تو یوں ہی گزر گئے، پھر لو پیڈ ایمپلائیز یونین نے فیصلہ کر لیا کہ تنخواہ بڑھانے کے لیے احتجاج کیا جائے۔ کچھ مدت کے لیے تو جلسے جلوس نکلتے رہے لیکن سرکار کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ ہم نے بھی اپنی مہم تیز تر کر دی۔ ہمارا مطالبہ تھا کہ سنٹرل گورنمنٹ ملازمین کی طرح ہی ہماری تنخواہیں بڑھا دی جائیں مگر ریاستی سرکار نے کوئی نوٹس نہیں لیا۔ آخر کار ہم نے احمری چوک پر دھرنا دی اور اس شاہراہ پر سارا ٹریفک روک لیا۔ پہلے تو سرکار نے زیادہ کچھ دھیان نہ دیا مگر جب پانی سر سے اوپر ہو گیا تو ڈی ایم نے پولیس کو لاٹھی چارج کرنے کا حکم دیا۔ بانس کے سونٹے، جنھیں پولیس لاٹھیاں کہتی ہے، بہت بھاری ہوتے ہیں اور شدید ضرب پہنچاتے ہیں۔ چنانچہ ہم نے سڑک پر ہی سٹیج بنایا تھا اس لیے ایک ایک کر کے ہمارے رہنما لیکچر دے رہے تھے اور آگے کی کارروائی کے بارے میں ہمیں مطلع کر رہے تھے۔ اتنی دیر میں نہ جانے کہاں سے پولیس کا ایک جتھا، ہاتھوں میں لاٹھیاں لیے ہوئے، ہماری طرف بڑھا اور تابڑ توڑ لاٹھی چارج کرنے لگا۔ کچھ لاٹھیاں میرے جسم پر بھی پڑیں۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ لاٹھیاں ٹانگوں یا جسم کے نچلے حصے پر ماری جاتیں مگر ایسے موقعے پر کون احتیاط برتتا ہے۔ جس کسی نے مجھ پر لاٹھیاں ماریں، ایک دو سیدھے میرے سر پر آلگیں اور میرے سر سے خون بہنے لگا۔ ساتھ ہی میں بے ہوش ہو گیا۔ اس کے بعد مجھے کچھ بھی پتہ نہ چلا کہ مجھے کس نے اٹھایا اور کب ہسپتال پہنچا دیا جہاں میرے سر پر ٹانکے لگائے گئے اور پھر مرہم پٹی کر لی گئی۔ ہسپتال سے کئی روز کے بعد چھٹی مل گئی۔ دریں اثنا گھر

والوں کو پتہ چل گیا سو وہ تیمارداری کے لیے ہسپتال پہنچ گئے۔

ہوش آنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ سونٹے انسان کا مہد سے لحد تک پیچھا نہیں چھوڑتے اور ان سے کہیں نہ کہیں پر ملاقات ہو ہی جاتی ہے۔ البتہ ان کی ہیئت بدل جاتی ہیں۔ کبھی چھڑی، کبھی کین، کبھی ڈنڈا، کبھی سونٹا اور کبھی لاٹھی.....!

☆☆☆
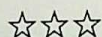
صوتی آلودگی

شور مچانا ہم ہندوستانیوں کا پیدائشی حق ہے۔

ہے نا عجیب سی بات ۔شور وغل سے پیدا ہورہی آلودگی پر انگلی اٹھانا کہاں کی عقلمندی ہے...!اور وہ بھی سوشل میڈیا پر...!

شور...! صوتی کثافت ....!ذہنی آلودگی .....! انسانی اعصاب پر اثر کرنے والی مضر آوازیں....! یہ سب اصطلاحات مغربی معاشرے سے متعلق ہوں تو ہوں، یہاں مشرق میں کون ان کی پرواہ کرتا ہے۔

صوتی کثافت سب سے زیادہ پھیلی ہوئی آلودگیوں میں سے ایک ہے ....بنی نوع انسان کے لیے تکلیف دہ....نہ صرف ماحولیاتی خسارہ بلکہ جسمانی اور دماغی صحت کے لیے بھی ضرر رساں ۔ بے چینی ، کھچاؤ، اور برہمی کی ایک بہت ناگوار علت ... مشینی اور ٹیکنالوجکل دور کی سوغات ....!

کچھ روز پہلے بالی وُڈ کے ایک گائک نے ٹویٹر پر مسجدوں سے صبح سویرے بلند ہورہی اذان پر پابندی لگانے کی درخواست کی ۔ مجھے اس کی اس حماقت پر ہنسی آئی ۔ مجھے یاد آیا کہ آٹو رکشا ،پسنجر گاڑی، پان کی دکان، شادی بیاہ کی تقریب یا پھر بھجن کیرتن کے دوران خود اس گائک کے گانے اتنی زور سے بجتے ہیں کہ کانوں میں انگلیاں دینے کو جی چاہتا ہے۔

لوگ صبح سویرے لاوڈ اسپیکروں پر اذان کی آواز سن کر جاگتے ہیں ...ان کا دن شروع

ہوتا ہے۔ راسخ العقیدہ لوگ اپنے گھروں سے نکل کر مسجدوں کی جانب نکل پڑتے ہیں یا پھر اپنے ہی گھر میں سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ مگر دوسری جانب کچھ لوگوں کے آرام میں خلل پڑتا ہے جو دیر رات تک ناچ گانوں کی محفلوں میں دھماچوکڑی مچا کر آسمان سر پر اٹھاتے ہیں یہاں تک کہ دور دور تک کسی کو کچھ بھی سنائی نہیں دیتا۔ اگر وہ پروگرام ٹیلی ویژن پر ٹیلی کاسٹ ہو رہا ہو تو کروڑوں لوگ سب کام چھوڑ چھاڑ کر اپنے چہیتے گلوکار کو سننے کے لیے بے تاب ہوتے ہیں اور رات بھر نہ خود سوتے ہیں نہ ہی اپنی فیملی کو سونے دیتے ہیں۔ یہ بات الگ کہ طلبہ کی تعلیم میں خلل پڑتی ہے اور غریب مزدور پیشہ لوگوں کی نیند حرام ہو جاتی ہے۔ کسی آٹو یا بس میں سفر کیجیے تو ان گائیکوں کے گانے اونچی اونچی آواز میں سن کر کان کے پردے پھٹ جاتے ہیں مگر کیا مجال کہ آپ ڈرائیور کو کہہ سکیں کہ بھائی آواز دھیمی کر لو۔ اس پس منظر میں دیکھا جائے تو یہ گلوکار صبح جلدی کیسے اٹھ سکتے ہیں۔ ایک تو دیر رات سے گھر لوٹتے ہیں اور واپس آ کر بہت دیر تک آنکھیں نیند کے لیے ترستی ہیں، تب کہیں جا کر صبح دم آنکھ لگی تو لگی ورنہ بغیر نیند کے رات گزر جاتی ہے۔ پھر کیسے ممکن ہے کہ وہ ان لاوڈ اسپیکروں کا شور برداشت کر سکیں۔

میں گہری سوچ میں پڑ گیا۔ آخر بانگِ نماز ہی کیوں؟ کلوں کا مسلسل شور وغل، ریل گاڑیوں کی چھک چھک اور مسلسل سیٹیاں، موٹر، لاری، بسوں اور سکوٹروں کے انجنوں اور بھونپوؤں کی آوازیں، ہوائی جہازوں کی اڑانیں..... ہر طرف تو شور ہی شور سنائی دیتا ہے۔ گھروں میں، سڑکوں پر، بازاروں میں، سینما ہالوں میں، تفریح گاہوں میں، ڈانس ہالوں میں، جنتر منتر پر، ٹیلی ویژن پر، ریڈیو پر... ایسی کونسی جگہ ہے جہاں شور نہیں ہوتا...! کیا اس شور وغل سے آدمی کی نشو و نما پر مہیب اثر نہیں پڑتا؟ شاید اس طرف کسی کی توجہ نہیں جاتی اگر بالی وُڈ کے معروف گائک نے ٹوئٹر پر اذان کے لیے لاوڈ اسپیکر کے استعمال کے خلاف آواز نہ اٹھائی ہوتی۔ ورنہ ہندوستانی قوم ایک ایسی قوم ہے جو ہوا، پانی اور ماحول کی کثافتوں سے سمجھوتا کرنے میں یکتا ہے۔ اس قوم پر کچھ بھی ٹھونسیے... امریکا سے رد کیے گئے زہر اگلتے تانبے کے سمیلٹر اس دھرتی پر لگایئے، دھواں چھوڑتی

ہوئی دقیانوسی گاڑیاں استعمال کیجیے، کاربن مونوکسائڈ اگلتی فیکٹریاں نصب کیجیے، چمڑے کے کارخانوں سے نکلتی غلاظت گنگا اور جمنا میں بہادیجیے یا پھر گھروں کے اوپر نقصان دہ شعاع ریز ٹاور نصب کیجیے....کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ یہ تو انسانی نشو و نما کی علامتیں ہیں۔

خیر کوئی بحث طلب نکتہ چاہیے اس قوم کے اثر ورسوخ والے بے کار لوگوں کے لیے.....
ایسے موضوعات کو لے کر وہ روزانہ ٹی وی چینلوں پر بال کی کھال اتارتے ہیں جن سے انھیں کوئی ذاتی غرض نہیں ہوتی، پھر ملی ہوئی رقم شراب پینے میں اڑاتے ہیں۔ اب تو یہ تازہ موضوع مل گیا ہے کہ کیا مسجدوں میں اذان کے لیے لاوڈ اسپیکر ہونے چاہئیں یا نہیں؟ اس روز سے اس موضوع پر ٹیلی ویژن پر اتنی بحثیں ہوئیں کہ اس کے شور میں کچھ اور سنائی نہیں دیتا۔ ٹیلی ویژن پر ہر فن مولا بحث کرنے والے، عبقری، مولوی، پنڈت اور لبرل سب اپنی اپنی ہانکنے میں لگے ہوئے ہیں۔ کسی سے پوچھو بھئی تم اکیلے کیوں کار میں سفر کر کے آئے، پبلک ٹرانسپورٹ سے کیوں نہیں آئے، آخر دہلی میں تو سب سے زیادہ فضائی آلودگی انہی کاروں اور گاڑیوں کی وجہ سے ہے تو ماتھے پر بل پڑ جاتے ہیں۔ اتنا تو سب کو علم ہے کہ ان بحث ومباحث سے کہیں کچھ فیصلہ نہیں ہوتا۔ البتہ کئی لوگوں کی نماز قضا ہوتی ہے کیونکہ اس وقت وہ یہاں بحث کرنے میں مصروف ہوتے ہیں۔

میں نے جس کالونی میں فلیٹ لیا ہے وہاں سال بھر کوئی نہ کوئی تماشا ہوتا ہی رہتا ہے۔ دو بار نوراتر کی پوجا، دیوالی کے پٹاخے الگ، پھر سندر کانڈ اور نہ جانے کون کون سے کانڈ، ایک رات کسی فلیٹ میں جگ راتا ہو رہا ہے اور دوسری رات کسی دوسرے فلیٹ میں۔ رات بھر گانے والے چیخ چیخ کر بھگوان کو تلاشنے میں لگے رہتے ہیں۔ دراصل بھگوان کو کم اور اپنا روزگار تلاشنے میں زیادہ جٹے رہتے ہیں۔ اُدھر کچھ علاقوں میں قوالیوں کی محفلیں رات بھر جمتی ہیں اور پھر رام لیلا کے ناٹک تو ہماری پرمپرا ہی ہے۔ کہیں کوئی نجات کا طریقہ نظر نہیں آتا ۔ اودھ میں تو طوائفیں بھی ان محفلوں کی زینت بن جاتیں ہیں۔ چلو روزگار کا وسیلہ تو بن جاتا ہے۔ مگر بچوں کی پڑھائی کا کیا ہوگا؟ صبح سویرے جنھیں اسکول یا دفتر جانا ہوتا ہے ان کے بارے میں کوئی سوچتا ہی نہیں۔ دیوالی

کے پٹاخوں کو دیکھ کر باقی مذاہب کے لوگوں کی آرزوئیں بھی جاگ اٹھی ہیں، انھوں نے بھی عید، گورو پورب، مہاویر جینتی، اور بدھ پورنیما کے دن پٹاخے پھوڑنے کا قصد کرلیا ہے۔ میرا کمرہ ساونڈ پروف نہیں ہے۔ رات بھر بھجن کیرتن کی آوازیں چلی آتی ہیں جو سونے نہیں دیتیں۔ پر احتجاج کرنے کی طاقت کس میں ہے۔ جو بولے اس کا برا حال۔ سب خاموش۔ کئی بار پولیس میں جا کر رپورٹ لکھوائی، پولیس آئی اور ساتھ ہی بنے کمپلیکس میں ہو رہے شور وغل کو دیکھا، ان کو ہدایت دے کر چل دیے۔ نہ شور وغل بند ہوا اور نہ پولیس نے کوئی کارروائی کی۔

اذان کا رواج تو کب سے چلا آرہا ہے۔ مسجدوں کے میناروں سے عقیدتمندوں کو بلانے کی پرمپرا تو زمانہ قدیم سے چلی آرہی ہے البتہ لاوڈ اسپیکر کا استعمال نہیں ہوتا تھا۔ لاوڈ اسپیکر تو انیسویں صدی کی ایجاد ہے۔ اس سے پہلے تو موذن اپنی آواز پر ہی بھروسہ کرتا تھا۔ اب تو دنیا کا نقشہ ہی بدل گیا ہے۔ مسجدوں ہی میں کیوں، ہر اس عبادت گاہ میں لاوڈ اسپیکر نصب کیے گئے ہیں جہاں ایشور نے پناہ لی ہے۔ دنیا کے شور وغل کے بیچ ہر کوئی اپنی آواز اس تک پہنچانا چاہتا ہے۔ ان کا اصول ہے کہ جب لوہا لوہے کو کاٹ سکتا ہے تو شور شور کی تسخیر کیوں نہیں کرسکتا؟

بالی وُڈ کے مہان گا یک کو نہ جانے کیا سوجھی کہ اس میں رخنہ ڈالنے کے لیے سینہ بہ سپر ہو گیا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے سوشل میڈیا کے عادی لوگ دو خیموں میں بٹ گئے۔ ایک وہ جو گلوکار کے حق میں ہیں اور دوسرے وہ جو گلوکار کی مخالفت کر رہے ہیں۔ سوشل میڈیا پر ایک دوسرے کو برا بھلا کہنا اور گالیاں دینا تو معمول بن چکا ہے۔ موڈرن تہذیب کی دین جو ہے۔

میں خود اس موضوع پر فکر مند ہوں۔ آخر کب تک ہم شتر مرغ بنے پھرتے رہیں گے۔ کچھ راستہ تو نکالنا پڑے گا۔ شور وغل کے مختلف ذرائع کا تجزیہ تو کرنا پڑے گا۔ ایک اذان کا شور ہی تو نہیں جو ہمارے ماحول کو آلودہ کرتا ہے۔ بہت سی چیزیں ہیں جو ہماری زندگی کو متاثر کرتی ہیں۔ مگر کون کسے سمجھائے؟ میرے من میں ایک سوال اٹھتا ہے کہ ہندستان میں اگر لاوڈ اسپیکروں پر اذان دینے پر پابندی لگ جائے گی تو کیا شور وغل ختم ہو جائے گا؟

سوچنا پڑے گا کہ ہم کہاں جارہے ہیں۔ کہیں ہم اپنے ماحول کو اتنا غیر محفوظ تو نہیں بنار ہے ہیں کہ ہمارا حال بھی ڈائنوسورس کی طرح ہوگا اور ہم اپنے ہی محبس ماحول میں قید ہو کر نیست و نابود ہو جائیں گے۔

PATTOON PAR LIKHI TAHREEREIN

AFSANE WA INSHAIYE

BY: DEEPAK BUDKI

مصنف کے بارے میں

نام : دیپک کمار بُدکی قلمی نام : دیپک بُدکی

پیدائش : ۱۵ر فروری ۱۹۵۰ء بمقام سرینگر، جموں و کشمیر

ایڈریس : ۱۰۲-اے، ایس جی امپریشن، سیکٹر۴-بی، وسُندھرا، غازی آباد-۲۰۱۰۱۲

ای میل : deepak.budki@gmail.com موبائیل: 9868271199

تعلیم : ایم ایس سی، بی ایڈ؛ ایسوسی ایٹ، انشورنس انسٹی ٹیوٹ آف انڈیا، این ڈی سی

پیشہ: ریٹائرڈ ممبر، پوسٹل سروسز بورڈ، نئی دہلی؛ ۹ سال آرمی پوسٹل سروس (لیفٹنٹ کرنل)

کارنامے :تقریباً ۱۵۰افسانے، ۱۷۰افسانچے، ۲۷۵تبصرے اور ۸۰ تنقیدی و تحقیقی مضامین؛ افسانے ہندی، تیلگو، مراٹھی، بنگالی، کشمیری، پہاڑی اور انگریزی میں ترجمہ ہو چکے ہیں۔ دو ترجمہ شدہ کتابیں ہندی میں اور ایک انتخاب انگریزی میں شائع ہو چکا ہے۔ انگریزی/ بنگالی کی ۳ر اینتھالوجیوں میں ۳ر افسانے شامل کیے گئے ہیں۔ ایک کہانی دوردرشن کشمیر پر ٹیلی وائز ہوئی اور کئی کہانیاں آل انڈیا ریڈیو کشمیر اور اردو سروس سے نشر ہوئیں۔

تصانیف :(افسانے): ادھورے چہرے، چنار کے پنجے، زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی، ریزہ ریزہ حیات، روح کا کرب، اب میں وہاں نہیں رہتا، جڑوں کی تلاش؛ (افسانچے): مٹھی بھر ریت، یہ کیسا رشتہ؛ (سوانح عمری): لوحِ حیات؛ (مضامین و تبصرے): عصری تحریریں، عصری شعور، عصری تقاضے، عصری تناظر، عصری نقوش، ادبی مباحثے، جموں و کشمیر کا عصری ادب، عصری زاویے؛ کرشن چندر- میری نظر میں (تحقیق): اردو کے غیر مسلم افسانہ نگار

مقالہ (for ndc): Genesis of Kashmir Problem & Article 370

خصوصی نمبر: 'انتساب عالمی'، سروج (دیپک بدکی نمبر)، جولائی تا ستمبر ۲۰۱۶ء

گوشے : 'شاعر ممبئی' ستمبر ۲۰۰۴ء، 'انتساب' سرونج ۲۰۰۶ء، 'اسباق' پونے جولائی ۲۰۰۷ء، سہ ماہی 'عالمی میراث' پونے ۲۰۲۰ء

انعامات : راشٹریہ گورَوسمان (انٹرنیشنل فرینڈشپ سوسائٹی) ۲۰۰۹ء؛ ڈاکٹر منظر کاظمی ایوارڈ برائے فکشن ۲۰۱۹ (چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی)

MEEZAN PUBLISHERS

OPP. FIRE SERVICES HEADQUARTERS, BATAMALOO, SRINAGAR-190009, KASHMIR.

CELL: 9419002212, 8494002212, 7006773403

email: meezanbooks2020@gmail.com, meezanpublishers@gmail.com